Regd. L. No. 7243
Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

مارچ 1970

اس پرچہ میں

## قرآنی منشور

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

# طلوعِ اسلام

لاہور

| بدلِ اشتراک | قیمت فی پرچہ | ٹیلیفون |
| --- | --- | --- |
| سالانہ — پاکستان — دس روپے | پاکستان — ایک روپیہ | ۸۰۸۰۰ |
| سالانہ — ہندوستانی — پندرہ روپے | ہندوستان | خط و کتابت |
| سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ | ڈیڑھ روپیہ | ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور |

| نمبر (۳) | مارچ ۱۹۷۰ء | جلد (۲۳) |
| --- | --- | --- |


## فہرست


| | | | |
| --- | --- | --- | --- |
| (۱) | لمعات | | ۲ |
| (۲) | قرآنی منشور | | ۹ |
| (۳) | ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء | | ۲۵ |
| (۴) | اُردو میں نماز | (محترم پرویز صاحب) | ۴۱ |
| (۵) | نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ | (محترم پرویز صاحب) | ۴۹ |
| (۶) | مذہبی القاب کی شرعی حیثیت۔ | (محترم رفیع اللہ صاحب) | ۵۹ |
| (۷) | نقد و نظر | | ۶۵ |
| (۸) | حقائق و عبر | | ۶۶ |
| (۹) | باب المراسلات | | ۷۰ |



ایڈیٹر۔ محمد خلیل، ناشر۔ سراج الحق : مقامِ اشاعت ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف :۔ مطبوعہ ۔ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام، کہ جمعیّتِ آدم

اگلے دنوں برطانیہ کے مشہور ریاضی دان اور مفکر لارڈ برٹرنڈرسل کا انتقال ہوگیا۔ دنیا کے بڑے بڑے اربابِ فکر و سیاست نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کی نادر صلاحیتوں کا تذکرہ کیا۔ اس کی خدمات کو سراہا، ان سب میں قدرِ مشترک' ان کی یہ خصوصیت بتائی گئی کہ وہ عصرِ حاضر کا عظیم (HUMANITARIAN) تھا۔ یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ مغرب کے نظریۂ قومیت (نیشنلزم) نے خود ساختہ حدود و قیود کی بنا پر انسانیت کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے کہ یہ دنیا' انسانوں کی بستی کے بجائے درندوں کا بھٹ بن کر رہ گئی ہے۔ اس پر نظامِ سرمایہ داری کی لعنت' جس سے ایک ہی قوم کے اندر، تضادِ مفادات کی بنا پر ایک گروہ دوسرے گروہ کا شکاری اور ایک فرد دوسرے فرد کی جان کا لاگو ہو رہا ہے' بیسویں صدی کا ذکر ہے کہ انسانیت کی اس زبوں حالی پر مغرب ہی کے بعض مفکرین کا جی بھر آیا اور انہوں نے ایک ایسی تحریک کی طرح ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، وطن کی حدود سے بلند ہو کر انسان کو محض انسان کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ اور جس حد تک ممکن ہو انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کی جائے۔ اس تحریک کو (HUMANISM) کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ نوعِ انسانی کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دینے میں مذہب کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے انہوں نے مذہب سے بھی انکار کر دیا۔ اس مسلک کا نام (NATURALISTIC HUMANISM) قرار پایا۔ برٹرنڈرسل اسی تحریک سے وابستہ تھا۔ اور اگرچہ وہ بہت بڑا ماہر ریاضیات اور مفکر تھا لیکن اس کی جس خصوصیت کو سب سے زیادہ سراہا گیا وہ اس کا یہی جذبۂ ہمدردیٔ نوعِ انسانی تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ خیال کہ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کی حدود سے ماوراء انسان کو محض انسان کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اسے ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منسلک کیا جائے' بیسویں صدی کے یورپ کا پیدا کردہ ہے یا یہ تصور اس سے پہلے بھی کہیں موجود تھا؟

آپ قرآن کریم کو کھولئے۔ اس میں آپ کو یہ عظیم اعلان نظر آئے گا کہ' نوعِ انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) تھی۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور اس طرح یہ برادری ٹکڑے ٹکڑوں میں بٹ گئی (۱۰ : ۱۹) ان منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر' انسانوں کو پھر سے ایک برادری میں منسلک کرنے کے لئے خدا نے حضرات انبیاء کرامؑ کو مبعوث کیا۔ (۲۱۳ : ۲) یہ ہے قرآن کی رُو سے' آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی غایت و منتہیٰ۔ اس تصور کو محسوس شکل میں لانے کے لئے ایک عملی پروگرام کی ضرورت تھی۔ اس پروگرام کی ابتداء' ملتِ اسلامیہ کے مؤسسِ اولیٰ' حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک امت کی تشکیل کی جو اس تحریک کو عملی جامہ پہنائے۔ جب کسی نظریہ کو عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کا اظہار محسوس علامات (SYMBOLS) کے ذریعے کیا جاتا ہے ـــ جیسے جھنڈا' کہ وہ مملکت کی شوکت و عظمت کا محسوس نشان ہوتا ہے یا دارالسلطنت کہ وہ مملکت کی قوت' استحکام اور بقا کی محسوس علامت ہوتا ہے۔ خدا نے اس عالمگیر تحریک اخوتِ انسانی کے لئے (مکہ میں) کعبہ کو محسوس علامت کے طور پر تجویز کیا۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ...... (۳/۹۵-۹۶) دنیا میں سب سے پہلا گھر جو کسی خاص فرد' خاندان' قوم یا مملکت کے لئے نہیں بلکہ' پوری کی پوری نوعِ انسانی کے لئے وجود میں لایا گیا' مکہ میں کعبہ تھا' اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ یہ گھر کسی خاص فرد' قبیلہ' قوم یا گروہ کا نہیں' عالمگیر انسانیت کی وحدتِ جامعیت کا مرکز ہے' خدا نے اسے اپنا گھر (بیتی) کہہ کر پکارا ـــ یاد رہے کہ خدا نے جس چیز کو "اللہ کی" کہہ کر پکارا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے نوعِ انسانی کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔
ـــ کعبہ کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ اسے بیتی (میرا گھر) کہنے کے بعد' سارے قرآن میں "للناس" کہا گیا ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کا گھر ـــ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (۲/۱۲۵) تمام نوعِ انسانی کے یکجا ہونے کا مقام ـــ دوسری جگہ اور واضح الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔ یہ مقام سب انسانوں کے لئے یکساں کھلا ہوگا۔ اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ مَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۳ : ۹۶) جو بھی اس کے سایۂ عاطفت میں آجائے گا اسے ہر طرح کا امن نصیب ہوگا اور اس کی غایت یہ بتائی گئی کہ جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷) مقصود اس سے یہ ہے کہ پوری نوعِ انسانی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔ دنیا میں نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج رہے

نہ محکوم۔ یعنی جس نظام کا مرکز محسوس کعبہ ہے اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو جائے اور انسانیت کو صحیح معنوں میں آزادی حاصل ہو۔

اس مرکز محسوس کی تعیین وتعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .....(۲۲/۲۷) پوری انسانیت میں اعلان کر دو کہ وہ یہاں آئیں۔ انہیں پکار پکار کر بلاؤ۔ انہیں یہاں آنے کی دعوت دو۔ ان سے کہو کہ سوار بھی آئیں اور پیادہ بھی۔ نزدیک کے لوگ بھی آئیں اور دور کے بھی۔ (۲۲/۲۷) سوال یہ ہے کہ لوگ یہاں کیوں آئیں۔ انہیں کس مقصد کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے اس اہم سوال کا جواب تین لفظوں میں اس انداز سے دیا ہے کہ ان کی جامعیت کو دیکھ کر روح وجد میں آجاتی ہے۔ کہا کہ وہ یہاں آئیں ــــ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (۲۲/۲۸) تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے ــــ عالمگیر انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے ــــ کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ آئیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اِدھر اس تحریک کے داعی، اس نظام کے علمبردار سے یہ کہا گیا اور اُدھر آنے والوں کو تلقین کی گئی کہ یاد رکھو۔ تمہارے اس اجتماع میں کوئی انفرادی اور ذاتی غرض پوشیدہ نہ ہو۔ یہاں آؤ ضرور لیکن اس خیال کو دل میں لئے ہوئے کہ یہ سب کچھ نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے ہوگا ــــ کسی خاص قبیلہ۔ گروہ یا قوم کے مفاد و مصالح کے لئے نہیں ــــ اس حقیقت کو قرآن نے (اپنے مخصوص انداز کے مطابق) للہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جہاں کہا کہ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا۔ (۳/۹۷) جس شخص کو بھی اس مرکز تک پہنچنے کی راہ مل سکے وہ یہاں ضرور آئے۔ لیکن صرف اللہ کے لئے آئے۔ اس میں کسی اور غرض کو شامل نہ کرے کہ یہ شرک ہوگا ــــ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ۔ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ۔ (۲۲/۳۱) جس کے پیش نظر کوئی اور مقصد ہو وہ یہاں نہ آئے (۹/۲۸) اسے اس کے قریب تک پھٹکنے نہ دو۔ (۲۲/۲۵) اس کا اعلان کر دو کہ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (۲۲/۲۵) جو شخص یہاں کوئی ٹیڑھی چال چلنا چاہے گا اور جس مقصد کے لئے یہ اجتماع ہو رہا ہے اس سے الگ کوئی اور مقصد اپنے سامنے رکھے گا اسے سخت سزا دی جائے گی

ان اغراض ومقاصد کو واضح کر دینے کے بعد اس عظیم تحریک وتنظیم کے داعی حضرت ابراہیمؑ سے کہہ دیا کہ تم اس بلند و بالا پروگرام کی تکمیل میں کامیاب ہو گئے ہو اسلئے اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۲/۱۲۴) تم نوعِ انسانی کی امامت (لیڈرشپ) کے مستحق ہو۔ نوعِ انسانی کی لیڈرشپ کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت بخشیوں کا نظام قائم کرے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا لیکن آپ کے بعد آپ کے نام لیواؤں نے کعبہ کی اس غرض وغایت کو بھی بھلا دیا اور اس اجتماع کے مقاصد و مصالح کو بھی فراموش کر دیا۔ رفتہ رفتہ کعبہ ان کے لئے پرستش کا مقام

اور حج کا اجتماع، ان کے قبائلی تفاخر و تکاثر کا ذریعہ، قومی مفادات کے حصول کا وسیلہ اور جاہلانہ رسوم و مناسک اور تفریحات و منافسات کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ زمانہ صدیوں تک کروٹیں بدلتا رہا تاآنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمینِ حجاز میں خدا کے آخری نبیؐ کا ظہور ہوا جس کے ذمے یہ فریضہ عاید کیا گیا کہ وہ ملتِ ابراہیمیؑ کا احیاء کرے۔ اس فریضہ کی تکمیل کے لئے آپؐ نے سب سے پہلے ایک امت کی تشکیل فرمائی۔ اس امت کی خصوصیت بھی یہی بتائی گئی کہ اسے نوعِ انسان کی منفعت کوشیوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۱۰) "تم بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔" تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کرو کہ وہ غلط راہوں پر نہ چلنے پائے۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) اور رسولؐ تمہارے اعمال کا نگران ہو۔

اس امت کی تشکیل کے بعد آپؐ نے ایک مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اسلئے کہ جس قوم نے عالمِ انسانیت میں امن قائم رکھنے کا فریضہ ادا کرنا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خود ہر خطرہ سے مامون و محفوظ ہو اور اسکے پاس ایسے اسباب و ذرائع ہوں جن سے وہ قیامِ امن کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ جس قوم نے نوعِ انسانی کے لئے پوری کی پوری آزادی کا بیڑہ اٹھانا ہو، سب سے پہلے اُسے خود ہر نوع غلامی سے آزاد ہونا چاہیئے اور یہ کچھ ایک مستحکم اور طاقتور مملکت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کی مملکت قیام میں آ گئی تو پھر ان سے کہا گیا کہ تم مسلکِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں عالمِ انسانیت کو اپنے نظام کے مرکز، کعبہ، میں جمع ہونے کی دعوت دو تاکہ وہ یہاں آکر اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیں کہ تمہارا نظام انسانیت کی منفعت بخشیوں کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ چنانچہ اس امت کے زیرِ اہتمام یہ پہلا اجتماع ۹ھ میں منعقد ہوا۔ اور رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں دوسرا اجتماع اگلے سال ۱۰ھ میں جس میں (کہا جاتا ہے کہ) ایک لاکھ نفوس جمع ہوئے تھے۔ اس زمانے کے حالات کے مطابق، یہ اجتماع کچھ چھوٹا اجتماع نہیں تھا۔

حضرت ابراہیمؑ جب تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو آپ نے بحضورِ رب العزت عرض کیا تھا کہ یہ مقام ایسی جگہ واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا — یہ وادیٔ غیر ذی زرع ہے — اس لئے وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ۔ (۱۴/۳۷)۔ تو ایسا انتظام کر دے کہ انہیں یہاں سامانِ زیست کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ تاکہ ان کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ جب خود مکہ کے رہنے والوں کے لئے سامانِ خور و نوش باہر سے آتا ہو تو وہ لاکھوں کے اس اجتماع کے لئے کھانے پینے کا کیا انتظام کر سکیں گے۔ اس کے لئے کہا گیا کہ یہاں آنے والے، اپنے آپ کو اہلِ مکہ کا مہمان نہ سمجھیں بلکہ اپنے کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ اس کے لئے بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ آتے وقت کچھ جانور فالتو ساتھ لائیں۔

آتے وقت ان سے باربرداری وغیرہ کا کام لیں (۲۲/۳۳)۔ یہاں پہنچکر انہیں حسب ضرورت ذبح کریں۔ ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور اس میں یہاں کے حاجتمندوں کو بھی شریک کرلیں۔ (۲۲/۲۸ و ۳۶) اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ ان مویشیوں کو جو یہاں ذبح کرو' تو (دوسری قوموں کیطرح جن کا عقیدہ تھا کہ جانوروں کے خون سے خدا خوش ہوتا ہے) تم یہ نہ خیال کرلینا کہ ان کا گوشت پوست بارگاہِ خداوندی میں پہنچ رہا ہے۔ (۲۲/۳۷) اس سے مقصود تمہارے لئے سامانِ خورد ونوش بہم پہنچانا ہے اور بس۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے' امتِ مسلمہ اس اجتماع کا انتظام کرنے والی (C ONVENER) ہوگی۔ وہ تمام نوعِ انسانی کو اس میں شرکت کی دعوت دیگی (بجز ان کے جو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے' انسانوں کو مختلف قوموں فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم کرنے اور ان میں باہمی عداوت اور منافقت قائم رکھنے کے درپے ہوں)۔

یہ تھا حج سے مقصود۔ یعنی اس امتِ وسطیٰ کے نمائندے' اپنے نظام کے مرکز' کعبہ میں جمع ہوں۔ اپنے اجتماعی مسائل پر غور وفکر کریں۔ باہمی مشاورت سے انکا حل سوچیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے پروگرام مرتب کریں اور اس کے ساتھ ہی اقوامِ عالم کو دعوت دیں کہ وہ آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ہم امنِ عامہ کے قیام اور عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ کررہے ہیں۔

لیکن جس طرح' اس نظامِ اجتماعیہ کے مؤسسِ اولیٰ حضرت ابراہیمؑ کے بعد' اُن کے نام لیواؤں نے اس اجتماع کو کچھ کا کچھ بنادیا تھا' اسی طرح' اس نظام کو تکمیل تک پہنچانے والے نبی آخرالزمانؐ کی امت نے بھی رفتہ رفتہ اس عظیم پروگرام کو' بےجان رسومات اور بے روح مناسک کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ـــ جب دین' مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے تو اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ دین کے پروگرام کے مختلف اجزاء وعناصر کی شکلیں تو ویسی کی ویسی رہتی ہیں لیکن ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں محض ایک رسم کیطرح ادا کرلیا جاتا ہے اور ان مقاصد کیطرف کسی کا دھیان تک بھی نہیں جاتا جن کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اگر نبی اکرمؐ کے آخری حج میں ایک لاکھ کا اجتماع تھا تو اب اس میں شریک ہونے والوں کی تعداد دس بارہ لاکھ سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اجتماع (اقبالؒ کے الفاظ میں) شکوہِ ملک و دین کا مظہر ہوتا تھا اور ہمارے یہ اجتماعات' "ہجومِ مومنین" سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ اجتماع تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کرنیکا ذریعہ تھے اور ہمارے ان اجتماعات کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں شریک ہونے والے مسلمان بھی ایک برادری کے فرد نہیں ہوتے۔ قرآن کریم نے ایک اجتماع کی کیفیت یہ بتائی تھی کہ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ ان کے دل آپس میں جڑے ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے اجتماع کے متعلق کہا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ وہ بظاہر ایک جمعیت نظر آئینگے لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونگے۔ قرآن نے اُس زمانے کے مسلمانوں کے اجتماعات کو اول الذکر کیفیت کا حامل اور یہودیوں کے اجتماعات

کو شانی الذکر تشتت کا مظہر بنا یا تھا۔ سوچئے کہ ہمارا یہ اجتماع اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ کا مظہر ہوتا ہے یا قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی کا آئینہ دار؟ ہماری آج حالت یہ ہے کہ امت مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف مذہبی فرقوں، مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے ــــ یعنی قرآن کی نصِ صریح کی رُو سے عملاً شرک میں مبتلا ہے (۳۲ / ۳۰)۔ اور عرفات کے میدان میں اس جذب و انہماک سے جمع ہوتی ہے گویا (قرآن ہی کے الفاظ میں) یہ بنیانِ مرصوص ـــ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس میں شگاف نہیں ڈال سکتی۔ نتیجہ اسکا یہ ہے کہ ہم حج کو توضیحاتِ آخرت کے لئے ایک رسم کے طور پر ادا کرتے ہیں، اور دنیاوی معاملات کے حل کے لئے کبھی رباط میں جمع ہوتے ہیں، اور کبھی قاہرہ میں۔ کہیں موتمر عالم اسلامی کا انعقاد ہوتا ہے اور کہیں بین الملی کانفرنسوں کا قیام۔ نتیجہ ان اجتماعات کا یہ نکلتا ہے کہ ہر اجتماع کے بعد ملت کا انتشار اور بڑھ جاتا ہے اور اس کے اُلجھے ہوئے مسائل اور زیادہ اُلجھ جاتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ جو قوم اپنے مرکز سے جدا ہو جاتی اور اسکی ہستی کی غرض و غایت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، وہ جو کچھ مذہب کے نام سے کرتی ہے کس قدر بے نتیجہ ہوتا ہے اور جو قدم اپنے دنیاوی معاملات کو سنوارنے کے لئے اٹھاتی ہے، وہ کس قدر الٹا اس کے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ اور ان رسومات کی ادائیگی اور ان اقدامات کی تکمیل میں جس قدر وقت، توانائی اور دولت صرف ہوتی ہے وہ کسطرح بیکار رہ جاتی ہے۔

قرآن نے کعبہ کو جب امت کے نظام کا مرکز محسوس قرار دیا تھا، تو اس سے متمسک رہنے کی اس قدر تاکید کی تھی کہ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ۔ (۲/۱۴۴)۔ تم دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، کاروبارِ حیات کے کسی شعبے سے بھی متعلق ہو، اس مرکز کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا کرو۔ تمہاری جدوجہد کا محور، تمہاری سعی و کاوش کا نقطۂ ماسکہ، تمہارا نصب العینِ حیات، ہمیشہ اور ہر حالت میں یہی رہنا چاہیئے۔ تمہاری کیفیت اس پرندے کی سی ہونی چاہیئے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ　　　نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

یہ تھی دین کے نظام میں کعبہ کی حیثیت۔ اور اب اس کا مصرف ہمارے ہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا کہ نمازوں میں اس کی طرف منہ اور حج میں اسکا طواف کر لیا جائے۔ صرفِ کثیر سے اس پر چڑھانے کیلئے غلاف تیار کرائے جائیں اور پھر اس غلاف کے جلوس نکالے جائیں۔ یہ تھا دین اور مذہب کا وہ فرق جس کے احساس سے اقبال نے دل کی انتہائی گہرائیوں سے ابھری ہوئی آہ کے ساتھ کہا تھا کہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　　　شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　　یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

اور یہی ہیں وہ قومیں جنکے متعلق قرآن کہتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا۔ اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ رہتے ہیں۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیاوی زندگی میں ان کی ساری تگ و تاز کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بہت بڑے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ انکا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ، انکے تمام اعمال رائیگاں جاتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ باقی رہی آخرت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۳-۱۰۶) تو اس میں ان کے اعمال اسقدر بے حقیقت ہونگے کہ انہیں تولنے کے لئے میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس وقت اس قوم کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ۔ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔ (۲۲/۱۱)۔ دنیا اور آخرت دونوں میں گھاٹا۔ ایسا گھاٹا جو صاف نظر آجائے۔ اسکی وجہ؟ یہ ہم سے نہ سنیئے۔ اس رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے سنیئے جو ہمیں دیکھ کر خدا کے حضور عرض کرینگے کہ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا۔ (۲۵/۳۰) اے میرے نشوونما دینے والے! یہ ہے میری وہ قوم جس نے تیرے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ اور یاد رکھیئے کہ جب تک کسی قوم میں مذہبی پیشوائیت رہیگی وہ قوم خدا کی کتاب تک نہیں پہنچ سکے گی کہ خدا کا ارشاد ہے کہ مذہبی پیشوا۔ علماء و مشائخ ــــ ناحق لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں اور يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (۹/۳۴)۔ اور انہیں خدا کے راستے کیطرف آنے سے روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر لوگ خدا کے راستے کیطرف آجائیں تو انہیں کما کر کھانا پڑیگا۔ یہ لوگ ساری عمر ان بے روح رسومات کی ادائیگی پر زور دیتے رہیں گے۔ انہیں ادا کرنے والوں کو جنت کی بشارتیں دینگے۔ ان میں کوتاہی کرنے والوں کو جہنم کے عذاب سے ڈرائیں گے۔ لیکن ان کی غرض وغایت، ان کا مقصود و مطلوب، ان کی حقیقت و ماہیت، کبھی سامنے نہیں لائینگے۔ نتیجہ یہ کہ دین کے ان عظیم ارکان کے ڈھانچے تو رہ جائینگے، دین باقی نہیں رہیگا۔ اور جب دین نہ رہے تو پھر انسان "بھی باقی نہیں رہتے۔ انسانوں کی ممی شدہ لاشیں رہ جاتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ صدیوں سے ہو رہا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

قرآن نے اسی لئے کہا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ۔ (۵۹/۱۹) دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ تم جانتے ہو کہ خدا فراموشی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ـــ؟ خود فراموشی!

اور اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے مقام ہی کو بھول جائے۔

(باقی)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

# قرآنی منشور

(اسلامی مملکت کیلئے دستوری ہدایات!)

# قرآنی منشور

انتخابات کے سلسلہ میں مختلف سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا منشور شائع کر رہی ہیں۔ طلوعِ اسلام کی نہ کوئی اپنی پارٹی ہے اور نہ ہی اس کا تعلق کسی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی سے ہے۔ نیز یہ عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے آنے والے انتخابات میں بھی حصہ نہیں لینا۔ اس کے باوجود احباب کی طرف سے تقاضا ہو رہا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ امتِ مسلمہ جو قرآن کریم کو اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کرے، اس کا منشور کس قسم کا ہوگا۔ منشور سے مراد ہوتی ہے وہ اصولی خطوط جن کے مطابق کوئی جماعت، نظامِ حکومت تشکیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ ذیل میں مختصر طور پر وہ اصول بیان کئے جاتے ہیں جن کے مطابق قرآنِ کریم چاہتا ہے کہ امتِ مسلمہ اپنی حکومت قائم کرے۔ اسی جہت سے ہم نے ان اصولوں کو قرآنی منشور کہہ کر پکارا ہے۔ ہر شق کی تائید میں یا تو قرآنی آیت درج کی گئی ہے اور یا اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حوالہ میں سورۃ کا نمبر اوپر ہے اور آیت کا نیچے۔

## ۱۔ حقِ حکومت

قرآنِ کریم کی رُو سے ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ (۱۷/۷۰) اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کی آزادی سلب کر کے اسے اپنا محکوم بنا لے۔ (۳/۶۴) لیکن تمدنی زندگی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ افراد کی آزادی ایک حد کے اندر رہے۔ یہ حدود کسی انسان کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے عاید کی گئی ہیں۔ اسی کو حقِ حکومت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰) حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ وہ اپنے اس حق میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) اور انسانوں سے کہا گیا

ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ (۱۲/۴۰)

## ۲۔ کتابُ اللہ کی حکومت

لیکن خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اس کی بات سن سکتے ہیں۔ اس لئے خدا کی محکومیت اختیار کس طرح کی جائے گی؟ وہ ہم پر حکومت کس طرح کرے گا؟ اس کا جواب اُس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی محکومیت' اسکی کتاب (قرآن کریم) کی اطاعت کے ذریعے اختیار کی جائے گی۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بنالوں' درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجدی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا' قرآنی حکومت اور غیر قرآنی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر قرآنی اصول و احکام کی کارفرمائی کیلئے قائم کی جاتی ہے۔ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے رسول اللہ سے (جنہوں نے سب سے پہلے قرآنی مملکت قائم کی تھی) کہا گیا کہ

فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ۔ (۵/۴۸) نیز (۵/۴۹)

تو ان میں' کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔ اور اب جبکہ تمہارے پاس حق آچکا ہے تو لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کر۔

لہٰذا' یہ کہنا غلط بھی ہے کہ حقِ حکومت عوام کو حاصل ہے اور وہی اقتدار کے مالک ہیں۔ قرآن کی رُو سے حقِ حکومت نہ عوام کو حاصل ہے نہ خواص کو۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے جو اس کی کتاب کی حاکمیت کی شکل میں نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر' قرآنی مملکت میں حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) صرف کتاب اللہ کو حاصل ہوتی ہے۔

## ۳۔ غیر متبدل ضابطہٴ حیات

قرآن کریم مکمل ضابطہٴ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ کی جامع

ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تغیر و تبدل۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ...... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا؛

مکمل اور غیر متبدل بھی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی۔ (۱۵/۹)

## ۴۔ ثبات و تغیر کا امتزاج

لیکن قرآن کریم میں، بجز چند احکام، زندگی کے عملی مسائل کے لئے اصولی راہ نمائی دی گئی ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں اور قرآنی مملکت اس کی مجاز ہے کہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تفصیلی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ احکام، حسبِ ضرورت بدلتے رہیں گے۔ قرآنی حکومت ثبات و تغیر کے اسی حسین اور قابلِ عمل امتزاج کی مظہر ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں؛

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اسلئے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں ـــــ وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائیگی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

(خطباتِ الٰہیاتِ جدیدہ)

## ۵۔ تشکیلِ مملکت کی ذمہ داری

قرآنِ کریم کے اصولوں کی اساس پر تشکیلِ مملکت کی ذمہ داری پوری کی پوری امتِ مسلمہ پر عاید ہوتی ہے، نہ کہ اس کے کسی خاص گروہ پر۔ (قرآن میں مملکت کا لفظ نہیں آیا۔ اس کے لئے لفظ ہی امت کا استعمال کیا گیا ہے) اس امت کو کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ہے (۳۵/۳۲) اور اس کے فرائضِ زندگی کی تصریح ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

(۳/۱۱۰)، نیز (۲/۱۴۳)، تم بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم ان باتوں کو قانوناً ناقابلِ ذکر و جنہیں قرآن صحیح قرار دیتا ہے اور ان امور کو حکماً بند کرو جنہیں وہ غلط کہتا ہے۔

اس فریضہ کی ادائیگی میں امت کے تمام افراد — مرد اور عورت — یکساں شریک ہوتے ہیں۔ (۹/۷۱)

## ۶۔ تمکن فی الارض

ان احکام و قوانین کی تنفیذ کے لئے سیاسی قوت کی ضرورت لابدی ہے۔ اسے قرآن نے "تمکن فی الارض" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ تمکن پوری کی پوری امت کو حاصل ہوگا، کسی ایک گروہ کو نہیں۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ..... اُمُوْرُ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ملک کی زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے۔ منکر سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام معاملات آخر الامر خدا (کی کتاب) کی طرف لوٹیں گے۔ اسے استخلاف فی الارض (یا خلافت) بھی کہا گیا ہے۔ یہ تمکن یا استخلاف دھاندلی سے حاصل نہیں کیا جاتا، بلکہ خدا کے ابدی قوانین کی صداقت پر ایمان لانے اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کاموں کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ (۲۴/۵۵)

انسانی زندگی کی ہیئتِ اجتماعیہ کے اس پورے تصور کو الدین کہا جاتا ہے جس کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں —

لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔ (۸۲/۱۹)

اس میں کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہوگا۔ اور تمام معاملات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہونگے۔

اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے۔ ( ۳/۱۲ ; ۳/۸۴ )

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ تمکن فی الارض ( اپنی آزاد مملکت ) کے بغیر اسلامی زندگی بسر ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے ہر نبی کو کتاب و نبوت کے ساتھ حکومت بھی عطا کی تھی۔ ( ۶/۹۰ )

## ۷۔ نظریۂ قومیت اور امت میں تفرقہ

قرآن کی رو سے، تمام دنیا کے انسان، دو قوموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو قرآنی فلسفۂ حیات کو صحیح تسلیم کریں، بلا لحاظ رنگ۔ نسل۔ زبان۔ وطن۔ ایک قوم کے افراد۔ اور جو لوگ اس نظریۂ زندگی کے خلاف کسی اور نظریہ کے قائل ہوں، وہ دوسری قوم کے ارکان۔ اوّل الذکر کو جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کو کفار ـــــ یعنی اسلامی نظریۂ زندگی کو نہ ماننے والے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ ( ۶۴/۲ )

خدا وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا۔

اس گروہِ مومنین کو امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے۔ مومن اور کافر ( مسلموں اور غیر مسلموں ) کو ملا کر ایک قوم تصور کرنے کا نظریہ اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور کھلا ہوا کفر۔ اسی طرح امتِ مسلمہ ( مسلمانوں ) کے اندر کسی قسم کا تفرقہ ـــــ خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی شکل میں۔ خواہ وہ علاقائی نسبتوں کی وجہ سے ہو اور خواہ نسلی امتیاز کی بنا پر ـــ قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ اور خدا کے عذاب کا موجب۔ ( ۳۰/۳۲ ) رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ جو لوگ امت میں اس قسم کی تفریق پیدا کریں، تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ( ۶/۱۶۰ )۔ لہٰذا،

(۱) قرآنی مملکت کے حدود میں بسنے والے غیر مسلم مسلم قوم ( امتِ مسلمہ ) کے افراد نہیں تصور کئے جا سکتے۔ ( ان کی حیثیت اور حقوق کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی )

(۲) مسلمانوں میں نہ مذہبی فرقے جائز قرار پا سکتے ہیں اور نہ ہی سیاسی پارٹیاں۔ ( سیاسی پارٹیوں کو حکمتِ فرعونی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ۲۸/۴ ) نہ ہی اس میں علاقائی نسبتوں کی بنا پر کسی تقسیم و تفریق کو روا رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ذاتوں، گوتوں، برادریوں کی نسلی تفریق کی بنا پر کسی اختلاف کو۔ اس میں کسی کو مسلم کے سوا کسی اور نام سے بھی پکارا نہیں جا سکتا کہ ـــــ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ( ۲۲/۷۸ ) خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ امت میں تفرقہ انگیزی کو قرآن نے "کفر بعد ایمان" کہہ کر پکارا ہے اور دنیا اور آخرت میں روسیاہی کا موجب ( ۳/۱۰۵ )۔ باقی رہا امیر اور غریب کا فرق، تو یہ فرق حکومتِ خداوندی میں باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ اس میں معیارِ تفریق کفر اور اسلام ہوگا اور معیار

تکریمِ تقویٰ ۔

## ۸ ۔ نظم و نسقِ حکومت ۔ مشاورتی نظام

قرآنی مملکت میں امورِ مملکت تمام امت کی باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے"۔ سب سے پہلے قرآنی مملکت نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی تھی۔ اور خود حضورؐ کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۔ (۳/۱۵۸) "امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا کرو"۔

قرآن نے باہمی مشاورت کے لئے یہ اصولی حکم دیا ہے۔ اس کی مشینری کس قسم کی ہوگی، اس کی کوئی شکل اس نے متعین نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے وضع یا اختیار کرلے۔ ان کی مجلسِ مشاورت (یا پارلیمان) قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت کے متعلق قواعد و ضوابط مدون کرے گی اور اس میں (مغربی جمہوریت کے تتبع میں) حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کی کوئی تفریق نہیں ہوگی — قرآن نے دنیا میں دو ہی احزاب بتائے ہیں — حزب اللہ اور حزب الشیطان (۵۸/۱۹-۲۲)۔ مسلمانوں کی ایک جماعت دوسری جماعت کے مدمقابل بیٹھی ہو اور دونوں ایک دوسری کی مخالفت کریں یہ نقشہ، قرآنی مملکت کا قطعاً نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) "تم تمام کے تمام مل کر حبل اللہ (قرآن) کے ساتھ متمسک رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو" — کا نقشہ سامنے آئے گا۔ اس میں اظہارِ رائے کی آزادی ہوگی۔ اختلافی معاملات پر بحث و تمحیص بھی ہوگی۔ لیکن یہ نمائندگانِ ملت پارٹیوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوں گے۔

## ۹ ۔ مرکزِ ملت

نظم و نسقِ حکومت کے لئے ایک مرکزی کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے جو بہ حیثیت مجموعی تمام امور کی نگرانی کرے۔ چونکہ قرآنی مملکت سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی تھی، اس لئے اس مملکت کا مرکزی کنٹرول (جسے آج کی اصطلاح میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت کہا جاتا ہے) رسول اللہؐ کے ہاتھ میں تھا۔ حضورؐ کا یہی وہ فریضہ یا منصب تھا جس کے متعلق قرآن کریم میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (۲/۱۴۳) اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و امور کی نگرانی کرتے رہو اور تمہارے اعمال و امور کی نگرانی رسولؐ کرے۔

اس مرکز کے مقرر کردہ افسران ماتحت ہونگے لیکن ان کے اختیارات مرکز کے تفویض کردہ اور محدود ہونگے۔ تمام اختلافی امور مرکز کی طرف (REFER) کئے جائیں گے اور مرکز کا فیصلہ آخری ہوگا۔ (۴/۵۹) اور چونکہ تمام مسلمانوں نے (جن میں یہ افسرانِ ماتحت بھی شامل ہوں گے) اس قرآنی نظام کو بطیبِ خاطر اختیار کیا ہوگا، اس لئے احکامِ مرکز کے فیصلوں کو بطیب خاطر مانا جائے گا۔ ان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہیں ہونے دیجائیگی (۴/۶۵)۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ مرکزی کنٹرول ہوگا وہ تمام احکام و قوانین کی اطاعت خود بھی اسی طرح کریں گے جس طرح دیگر افرادِ امت۔ اس باب میں انہیں کوئی امتیازی خصوصیت حاصل نہیں ہوگی۔ وہ اعلان کریں گے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (۶/۱۶۳) "ان قوانین کے سامنے جھکنے والوں میں میرا نام سرفہرست ہے"۔ قانون کی خلاف ورزی کی انہیں بھی ویسی ہی سزا ملے گی جیسی دوسرے افرادِ مملکت کو۔ اس باب میں خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵) ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی ڈر ہے کہ اس کی پاداش میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اگر اس کے اعزہ و اقربا میں سے کوئی قانون شکنی کریگا تو اسے (عام افراد کے مقابلہ میں) دگنی سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰)

نبی اکرمؐ تو امت کے منتخب کردہ امیر نہیں تھے اس لئے حضورؐ کے منصب امارت سے الگ ہونے یا کر دینے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن حضورؐ کے بعد یہ منصب امت کے منتخب کردہ افراد کے سپرد ہوگا۔ اگر ان میں سے کوئی، قرآنی دستور کی خلاف ورزی کریگا تو جس مشینری نے اسے منتخب کیا تھا وہی اسے برطرف بھی کر سکے گی۔ اس لئے کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)

تو اسکی اطاعت مت کر جس کا دل قوانین خداوندی کیطرف سے غافل ہو جائے اور وہ اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور اس کا معاملہ حد سے گزر جائے۔

لہٰذا قرآنی مملکت میں،

(۱) ایک امت ہوگی جس میں نہ کوئی فرقہ ہوگا نہ پارٹی۔ نہ نسلی امتیازات ہوں گے نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر کسی قسم کی تفریق۔

(۲) اس کا مرکز مضبوط اور آخری اتھارٹی کی حیثیت رکھیگا۔ اسلئے اس کی ولایات (صوبوں) کو خود مختاری حاصل نہیں ہوگی۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا آخری فیصلہ مرکز کیطرف سے ہوگا اور اس کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکیگی۔ حکومت کا انداز وحدانی (UNITARY) ہوگا۔ ساری مملکت کی ایک حکومت۔

(۳) (مرکزِ سمیت) تمام عمالِ حکومت پر قانون کا اطلاق یکساں ہوگا۔

## ۱۰۔ نظامِ عدل

قرآنِ کریم میں حکومت کے لئے لفظ حُکم آیا ہے جس کے معنی "فیصلہ کرنے" کے ہیں۔ جب فیصلے قانون کے مطابق کئے جائیں تو اسے قانونِ عدل کہا جاتا ہے۔ گویا قرآنی مملکت کا اہم فریضہ نظامِ عدل قائم کرنا ہے۔ عام حکومتوں میں جو فیصلہ بھی رائج الوقت قانون کے مطابق ہوگا عدل کہلائیگا۔ لیکن قرآنی مملکت میں اسکے لئے بھی ایک بنیادی شرط ہے۔ وہ یہ کہ خود یہ قانون بھی قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۔ (۷/۱۸۱)

اور ہماری مخلوق میں ایک امت ایسی بھی ہے جو حق (قرآنِ مجید) کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی کے مطابق عدل کرتی ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت کی مجلسِ قانون ساز، جو قوانین مرتب کریگی انہیں سب سے پہلے اس کسوٹی پر پرکھنا ہوگا کہ وہ قرآنِ کریم کے احکام و اصول کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی قانون ان کے مطابق نہیں تو وہ ملک میں نافذ نہیں ہو سکیگا۔ وہ مملکت کا قانون کہلا ہی نہیں سکیگا۔ اس کے لئے بجائے اس کے کہ ایک غلط (خلافِ قرآن) قانون مرتب ہو کر ملک میں نافذ ہو جائے اور بعد میں عدالتیں اسے چیلنج کریں، یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ پہلے ہی یہ دیکھ لے کہ وہ قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ "عدالتِ عالیہ" اسلئے کہا گیا ہے کہ قرآنی مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوتا۔ اس میں جملہ امور مملکت کیطرف سے طے پاتے ہیں اور وہی قرآنی قوانین کی تعبیر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

## ۱۱۔ شخصی اور تمدنی قوانین

شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) اور تمدنی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق اس دور کی پیدا کردہ ہے جب اسلام، دین کی سطح سے اتر کر، مذہب کی سطح پر آ گیا تھا اور مذہب اور سیاست میں ثنویت (DUALITY) پیدا ہو گئی تھی۔ امور مملکت بادشاہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور شخصی قوانین مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں دے دیئے گئے تھے تاکہ وہ اپنی "مملکت" میں خوش رہیں اور حکومت سے کوئی تعرض نہ کریں بلکہ منبروں پر کھڑے ہو کر بادشاہوں کے حق میں خیر و برکت کی دعائیں مانگتے رہیں۔ اب اس قسم کی ثنویت سیکولر حکومت میں قائم رکھی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت میں اس کا تصور تک نہیں کیا

جا سکتا۔ اس مملکت میں تمام قوانین مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں اور اس کی طرف سے قائم کردہ نظامِ عدلیت گستری، ان قوانین کی تعبیر کرتا ہے اور ان کے مطابق فیصلے دیتا ہے اور ان فیصلوں کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاء کی تخصیص ہوتی ہے اور نہ ہی مختلف فرقوں کے لئے مختلف پرسنل لاز ہوتے ہیں۔ اس میں فرقے ہی نہیں ہوتے، اس لئے مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں حکومت کی طرف سے ایسے مشیرانِ قانون مقرر ہوتے ہیں جن سے لوگ (بلا معاوضہ) مشورہ لے سکتے ہیں کہ ان کے فلاں معاملہ کے متعلق قانون کیا کہتا ہے۔

عدل، اپنے بیگانے، دوست دشمن، ہر ایک سے یکساں طور پر کیا جائے گا، یعنی قانون کی نگاہ میں سب ایک جیسے ہوں گے۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو" (۵/۸) جرم کی سزا جرم کے مطابق دی جائے (۴۲/۴۰) جہاں دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اس میں اصلاح کا امکان ہے اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے (۵/۳۹) عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ملے (۶/۱۶۵)۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی۔ (۶/۱۶۵) قرآن کریم کا ایسا بنیادی اصول ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر گوشے پر ہوتا ہے۔ یعنی "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" اور لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۹) نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ نہ کوئی تم پر زیادتی کرنے پائے۔" اس کے معاشرہ کا اصول۔

## ۱۲۔ عدل بلا قیمت ہوگا

قرآنی مملکت میں عدل بلا معاوضہ (یعنی بغیر کچھ خرچ کئے) حاصل کیا جائے گا۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی صورت کبھی عدل کہلا سکتی ہے کہ آپ کسی صاحبِ قوت سے جا کر کہیں کہ میں کمزور آدمی ہوں اور فلاں زور آور میرا حق دبا کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری مدد کریں اور میرا حق اس سے دلا دیں اور وہ آپ سے کہے کہ مجھے سو روپیہ دو، تب تمہاری مدد کرتا ہوں؛ حکومت تو قائم ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ ہر ظالم سے مظلوم کی حفاظت کرے اور حقدار کو اس کا حق دلا دے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟ یہ تو مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

## ۱۳۔ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

قرآن نے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ (۲/۳۸) خوف،

خارجی خطرات سے ہوتا ہے اور حُزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآنی مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ ملک میں ایسی فضا پیدا کر دے جس میں کسی شریف انسان کو نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہو، نہ حزن گلوگیر۔ اسے نہ کسی سے کوئی ڈر ہو اور نہ ہی کوئی پریشانی۔ ڈر ہو تو صرف قانون کی خلاف ورزی کے نتائج کا۔ اور پریشانی ہو تو اس وقت جب اُس نے کسی مستقل قدر (PERMANENT VALUE) کو پامال کر کے، اپنی ذات کو اپنے ہاتھوں نقصان پہنچایا ہو۔

## ۱۴۔ نظامِ تعلیم

لیکن معاشرہ کی اصلاح تنہا قانون کی رُو سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی قلب ہے۔ اور حقیقی انقلاب، قلب و دماغ کی تبدیلی کا نام ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ (۱۳/۱۱)

خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

قوم میں نفسیاتی تبدیلی، تعلیم سے پیدا ہوتی ہے جس قسم کی تعلیم، اسی قسم کی قوم کی نفسیات۔ اور جس قسم کی اس کی نفسیاتی کیفیت، اسی قسم کی اس کی حالت۔ قرآن نے خود نبی اکرمؐ کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔ (۶۲/۲) "وہ انہیں کتاب (ضابطۂ خداوندی) اور دانش و بینش کی تعلیم دیتا ہے"۔ قرآن کی رُو سے، انسانوں کے لئے صحیح پروگرام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کے بچوں کی تعلیم اس نہج سے ہونی چاہیئے کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔

قرآنی مملکت میں، بچہ کی تعلیم کی ذمہ داری اس کے ماں باپ پر عاید نہیں ہوتی۔ قوم کے ہر بچے کی تعلیم کی ذمہ دار مملکت ہوتی ہے۔ اس لئے مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ہر بچے کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بنیادی تعلیم کے بعد مختلف مراحل پر دیکھا جائے کہ بچے کا رجحان کس طرف ہے اور مذاق کیسا۔ اس کی مزید تعلیم کا انتظام اُسی کے مطابق کیا جائے۔ اس طرح اس کی صلاحیتوں کی مناسب نشوونما بھی ہو جائے گی اور وہ انسانیت کی مشینری کا ایک مفید پرزہ بھی بن سکیگا جس سے حسنِ کائنات میں اضافہ ہوگا۔

## ۱۵۔ معاشی ذمہ داریاں

اب ہم زندگی کے اس گوشے کی طرف آتے ہیں جس میں قرآنی مملکت

کی ذمہ داریاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے مملکت کا نصب العین بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ .... (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے"۔ (اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم ایک جداگانہ موضوع ہے۔ سردست ہم اس کے دوسرے حصہ ایتائے زکوٰۃ کو لیتے ہیں۔ جس کا تعلق زیرِ نظر موضوع سے ہے)۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما"۔ لہٰذا ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ قرآنی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ دوسری جگہ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ۔ (۲۳/۴) وہ نشوونما بہم پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں۔ "نشوونما" میں انسان کی طبعی (جسمانی) نشوونما بھی شامل ہے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی۔ انسانی صلاحیتوں کے متعلق ہم گزشتہ عنوان (متعلقہ تعلیم) میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس جگہ انسان کی طبعی نشوونما کے متعلق بات کی جائے گی۔ عربی زبان میں سامانِ زیست کو رزق بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، جو مملکت خدا کے نام پر قائم کی جائے اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی اس ذمہ داری کو عملاً پورا کرے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ ۔ (۶/۱۵۲)۔ (۱۷/۳۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

مملکت کو اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے کے بجائے امت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔ وسائلِ پیداوار میں زمین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ زمین کے متعلق قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔ (۴۱/۱۰) ہے گی۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ جب زمین، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہیگی تو ظاہر ہے کہ صنعت (INDUSTRY) جس کا مدار زمین سے پیدا ہونے والی خام اشیاء پر ہے، کس طرح افراد کی ملکیت قرار پا سکیگی۔ وہ بھی امت کی مشترکہ تحویل میں رہیگی۔ (اصل یہ ہے کہ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا، اسلامی معاشرہ میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

اب رہا سرمایہ اور محنت کا سوال۔ سو قرآنی نظام میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ آپ قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک دیکھ لیجئے۔ آپ کو تین گوشے عمودی طور پر نظر آئیں گے۔

(۱) قرآن میں قدم قدم پر عمل۔ یعنی کام کرنے کی تاکید ہے۔ اس لئے قرآنی مملکت میں (بجز ان کے جو کام کرنے کے قابل نہ ہوں) کوئی فرد ایسا نہیں ہوگا جو کام نہ کرے ــــ یعنی جو مملکت کی پیداوار (PRODUCTION)

میں اضافہ کا موجب نہ بنے ——— اس میں فکری کاوشوں سے لیکر جسمانی محنت سب شامل ہیں۔

(۲) قرآن میں آپ کو انفاق. انفاق کی تاکید تو قدم قدم پر ملے گی ——— یعنی جو کچھ کماؤ اسے نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کھلا رکھو ——— لیکن کہیں ایک جگہ بھی اپنی کمائی (دولت) کو جمع رکھنے کی اجازت نظر نہیں آئے گی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے دولت جمع کرنے کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کو جہنم کے عذاب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ "جہنم آوازیں دے دیکر بلاتی ہے اسے جو دولت جمع کرتا ہے۔ اور پھر اسے تھیلی میں بند کرکے رکھ لیتا ہے" (۷۰/۱۸)۔ "تباہی ہے اس کے لئے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھیر نناویں کے پھیر میں پڑ جاتا ہے" (۱۰۴/۱)۔ "وہ شخص دین کی تکذیب کرتا ہے جو رزق کے سرچشموں پر بند لگا کر انہیں اپنے لئے روک لیتا ہے" (۱۰۷/۱)۔ "جمع شدہ سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان لوگوں کو داغا جائے گا جنہوں نے انہیں جمع کرکے رکھ چھوڑا تھا" (۹/۳۴)۔ قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔

(۳) قرآن کا نظام یہ ہے کہ ہر فرد کا سب (کام کرنے کے قابل فرد) پوری پوری محنت سے کمائے۔ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لیکر، باقی سب نوعِ انسان کی منفعت کے لئے مملکت کی تحویل میں دے دے ——— یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زاید ہے، سب کا سب"۔ ضروریات سے مراد ہے وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسان اپنے فرائض مفوضہ کے سرانجام دینے کے قابل ہو سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کسی کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) نہیں رہیگی تو سرمایہ کاری کا سوال کیسے پیدا ہوگا۔ "سرمایہ کاری" کے معنی ہوتے ہیں، محض سرمایہ (CAPITAL) سے کچھ کمانا۔ اسے قرآن نے ربٰو کا نظام کہہ کر پکارا ہے اور اس قسم کا نظام قائم کرنے والوں کو جنگ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ (۲/۲۷۹)

(۴) سوال یہ ہے کہ اس قسم کا نظام، جس میں ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق، پوری پوری محنت سے کام کرے لیکن اس میں سے صرف بقدر ضروریات کے لے کر، باقی سب دیگر ضرورت مندوں کے لئے دیدے، قائم کس طرح سے ہو سکیگا؟ اس کا جواب آسان ہے۔ قرآن جسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارتا ہے وہ ایک سوسائٹی ہوتی ہے۔ جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر بننا چاہے (یعنی مسلمان ہونا چاہے) وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (۹/۱۱۱)۔ ہر فرد، اپنی جان اور اپنا مال "اللہ کے ہاتھ" بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض

اسے جنت کی زندگی مل جاتی ہے۔ وہ اپنی فطری صلاحیتیں (حتیٰ کہ جان تک) اور اکتسابی ماحصل، سب مملکتِ قرآنی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور وہ مملکت اسے اس دنیا میں جنت کی سی زندگی دینے کی ضمانت دیتی ہے۔ (اور اس کا لازمی نتیجہ، حیاتِ اُخروی میں بھی جنت کی زندگی ہوتا ہے) وہ امت (جماعت) جو اس قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اس قسم کا نظام قائم کر سکتی ہے۔

یاد رکھیئے! قرآن کی رُو سے، بھوک اور خوف، خدا کا عذاب ہے۔ (۱۶/۱۱۲) ؛ (۲۰/۱۲۴)۔ اور خدا کے رسولؐ نے، افلاس کو کفر تک لیجانے کا موجب اور دنیا اور آخرت (دونوں جہانوں) میں روسیاہی کا باعث بتایا ہے۔ لہٰذا، جو مملکت، معاشرہ کو خوف سے مامون اور بھوک سے محفوظ نہیں رکھ سکتی، وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ کسی حادثہ کی وجہ سے ہنگامی طور پر ایسی حالت کا پیدا ہو جانا اور بات ہے، لیکن بھوک اور خوف، قرآنی معاشرہ کا معمول نہیں قرار پا سکتا۔ دوسری طرف اسے بھی سمجھ لیجئے کہ قرآنی مملکت میں، جو کچھ کسی کو ملتا ہے، کام کی وجہ سے ملتا ہے۔ (اس میں استثناء صرف ان کی ہے جو کام سے معذور ہوں۔ وہ اسے بطورِ حق لے سکتے ہیں۔ (۵۱/۲۴) سرمایہ کے معاوضہ میں کوئی کچھ نہیں لے سکتا۔ اس لئے اس میں انفرادی سرمایہ جنس کا سدباب کر رہ جاتا ہے۔ (اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اسلامی سوسائٹی میں سرمایہ کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں۔ ساری دولت، امت کا مشترک سرمایہ ہوتی ہے اور اسے نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔

## ۱۶۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآنی مملکت اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے جو قرآنی اصول و اقدار کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا فطری نتیجہ ہے کہ جو لوگ ان اصول و اقدار پر ایمان نہیں رکھتے (انہیں غیر مسلم کہا جاتا ہے) وہ اس مملکت کے امور کی سرانجام دہی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ امورِ مملکت میں شرکت تو ایک طرف، وہ اس قوم کے افراد ہی نہیں ہوتے۔ وہ اس مملکت میں عام انسانوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ مملکت کی طرف سے انہیں عام انسانی حقوق و مراعات کی ضمانت حاصل ہو گی اور ہر قسم کی حفاظت۔ انہیں "مذہبی" آزادی ہو گی جس سے مراد ذاتی اعتقادات، مذہبی رسوم اور پرستش ہے۔ ان کے شخصی قوانین الگ ہوں گے لیکن مملکت کے تمدنی قوانین کا ان پر بھی اطلاق ہو گا۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا (۶۰/۸) لیکن انہیں ایسے مقامات و مناصب حاصل نہیں ہو سکیں گے جن میں ان کی رسائی رموزِ مملکت تک ہو سکے۔ (۳/۱۱۷-۱۱۹)۔ نہ ہی وہ مملکت کے لئے قوانین سازی کے کام میں شریک ہو سکیں گے کیونکہ

جن قوانین کی بنیاد وحی خداوندی (قرآن) پر ہو' ان کے وضع اور مرتب کرنے میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس وحی کی صداقت پر یقین ہی نہ رکھیں!

## ۱۷۔ بین الاقوامیت

قرآن کا منتہائے نگاہ یہ ہے کہ وحی کی رُو سے عطا کردہ اصول و اقدار کے مطابق' تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کر دیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۔ (۲/۲۱۳)

تمام انسان (درحقیقت) ایک برادری کے افراد ہیں (لیکن یہ آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ۱۰/۱۹) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا جو انہیں اختلاف و افتراق کی تباہیوں سے آگاہ کرتے اور وحدت و ائتلاف کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دیتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ خدا نے ضابطۂ قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی معاملات میں حق و صداقت کے ساتھ فیصلہ کرے۔ (اور اس طرح انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنا دے)۔

اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے' وہ پہلے ایک ایسی امّت کی تشکیل کرتا ہے جو ایک خطۂ زمین میں' قرآنی مملکت کے قیام سے افرادِ مملکت کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا فریضہ ادا کرے۔ اس کے بعد' وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا ہے۔ آگے بڑھانے سے مراد یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آ کر مشاہدہ کریں کہ یہ مملکت' نوعِ انسان کی منفعت اور خوشحالی کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے (۲۲/۲۸؛ ۱۲/۱۰۸)۔ جب دنیا اس نظام کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھے گی تو وہ خود بخود اس کی طرف کھنچے چلی آئے گی۔ (۳/۱۱۰)۔ کسی کو زبردستی اس میں داخل نہیں کیا جائے گا ——— قرآنی نظام میں اکراہ (جبر) کو کوئی دخل نہیں۔ (۲/۲۵۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ' عالمگیر انسانیت' خدا کے تجویز کردہ نظامِ ربوبیت کے لئے کھڑی ہو جائے گی۔ (۹/۳۳)

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ۔ (۳۹/۶۹)

اور یہ کرّہ اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔

یہ ہے قرآنی مملکت کا منتہائے مقصود اور نصب العینِ حیات۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ایسا

ہوکر رہیگا۔ دنیا اپنے خود ساختہ نظامہائے تمدن و معاشرت کے ناکام تجارب کے بعد آہستہ آہستہ، اس طرف آتی چلی جائے گی اور اس طرح یہ نظامِ زندگی، دیگر تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائیگا۔ (۳۳)

پاکستان اسی مقصد کے حصول کی خاطر یہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے اس نظام کو یہاں متشکل کر لیا تو ہم نوعِ انسان کی امامت (لیڈرشپ) کے مستحق قرار پا جائیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ سعادت کسی دوسری قوم کے حصہ میں آجائے گی (۳۴) فطرت کا پروگرام آخر الامر اس انسانیت ساز نظام کی تشکیل ہے نہ کہ کسی خاص قوم کی سلطنت کا قیام ــــ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (۳۵) جو بھی اس نظامِ زندگی کے علاوہ کوئی اور نظام اختیار کرے گا تو اس کا وہ نظام میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کس قدر نقصان میں رہا۔

(۰)

## حرفِ آخر

یہ ہے ہمارا بصیرت کے مطابق، قرآنی مملکت کے لئے منشور۔ قرآنی مملکت سب سے پہلے نبی اکرمؐ کے زیرِ نگرانی اس امت کے افراد نے متشکل کی تھی جو اس منشور پر ایمان لاکر اس سوسائٹی کے ممبر بنے تھے اور ان میں سے ہر ایک نے یہ عہد کیا تھا کہ "اس نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت کے ہاتھوں اس قسم کی مملکت کا وجود میں آجانا مشکل نہیں تھا۔ لیکن ہماری قوم کی جو موجودہ حالت ہے اس کے پیشِ نظر اس قسم کا نظام فوراً قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بتدریج قائم ہوگا۔ جو لوگ قرآنی مملکت کے قیام کے آرزومند ہوں، ان کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس منشور کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھ کر اپنے حالات کے مطابق اس کی طرف بڑھتے جائیں۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

(×)

# ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

## ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

قوموں کی زندگی میں بعض دن (یعنی واقعات) ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا خود اس قوم کے تسلسلِ حیات کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ملتِ پاکستانیہ کی زندگی میں ایک ایسا ہی دن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا ہے۔ جب اس نے اپنے اس عزمِ راسخ کا اظہار کیا کہ وہ ایک جداگانہ مملکت قائم کرے گی جس میں وہ اپنے معاملاتِ زندگی کو قرآن کی روشنی میں طے کرنے کے قابل ہو سکیگی۔ جن حضرات نے وہ زمانہ دیکھا ہے (اور وہ ہم میں ابھی تک موجود ہیں) انہیں یاد ہوگا کہ مسلمانانِ ہند (بجز ان سوختہ بختوں کے جو مسلمان کہلانے کے باوجود، اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے) کس جذبۂ بے اختیارِ شوق سے اس دن کی آمد کے انتظار میں سرشارِ کیف و مستی تھے۔ چونکہ وہ واقعات ہماری نئی نسلِ نو کے سامنے ظہور میں نہیں آئے تھے، اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک اس تحریک کی کوئی ایسی تاریخ شائع نہیں ہوئی جس میں انہیں صحیح پس منظر کی روشنی میں کما حقہ پیش کیا گیا ہو۔ اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اپنی تاریخِ نو کے ان درخشندہ ابواب کو کبھی کبھی طلوعِ اسلام کے صفحات پر سامنے لاتے رہیں۔ اس لئے بھی کہ طلوعِ اسلام کو اس تحریک کے کاروانِ شوق کے ہراول دستہ میں شرکت کی سعادت حاصل رہی ہے اور اُس دور کی تاریخ اس کے (اُس زمانے کے) اوراق میں منضبط ہے۔

طلوعِ اسلام نے اس عظیم تقریب پر سب سے پہلے، قائدِ تحریک (جناب جناحؒ) کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا تھا جسے بکمالِ فخر و مسرت درج ذیل کیا جاتا ہے۔

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیباکی و حریت۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت و رسالت، شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست، پروانۂ شمعِ

اخوت وحمیت - طرۂ کلاہ ملک وملت - بطلِ جلیل ہندیاں - و قائداعظم اسلامیان - عزت مآب محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہٗ العالی۔

حریت نواز!

ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پا شکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو[1] کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا سر پر منڈلانے والی شبِ تیرہ وتار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں، دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دور۔ افقِ امید سے ایک شاہسوار رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے، منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کرکے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو!
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

[1] علامہ اقبالؒ جن کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہو چکی تھی۔

قوم کی صحیح راہ نمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُر نور تھیں، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بےکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگہِ دوربیں نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگِ زمیں میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پَر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسولؐ کافۃ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گِل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت دنیاوت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولّی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک شیخ[1] آتشِ نفس سرد دگاہِ واردھا کی ستعارے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں، اسلئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب شاہیں بچوں کے لئے اہنسائی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے[2]۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے (GENTLEMAN'S AGREEMENT) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متأثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تأمل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی اہلیت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آہنی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے نو کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا۔ کہ اس کس مپرسی کے عالم میں اور اس انتشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا۔ اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

---

۱۔ ابوالکلام آزاد ۔ ۲۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب (مرحوم)

آسماں نہیں سٹا نا نام و نشاں ہمارا

## بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جاں گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشر گاہِ وارد ھا ( RADIO STATION ) کے آلاتِ مکبر الصوت ( LOUD SPEAKERS ) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین"[1] کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نسیت کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو!

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا، اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے کہ جو حق پر ہو اُسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

## حریّتِ مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تنگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے۔ اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند ( MUSLIM - INDIA ) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطحی بین لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا ہے لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں، کہ

---

[1] ان کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے۔

مبدءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہنِ رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پرسوز و پُر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب و نظر اور عشق و عقل کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

## عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور ان کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں دی ہیں ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے، اس میں آئینی نقطہ نگاہ سے (CONSTI-TUTIONALLY) ابھی پراونشل لیگ کا قیام ابھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ لگانے کی دیر ہے۔ یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکار رہے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ

## سیّد القوم!

احباب طلوعِ اسلام جیسے ہزارہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے قوم کو اسی کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بر دوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

(اراکین احباب طلوعِ اسلام)

---(۰)---

پنجاب میں اس زمانے میں یونینسٹوں کی حکومت تھی اور اس کے وزیر اعظم سر سکندر حیات (مرحوم) بظاہر مسلم لیگ کے حامی لیکن بباطن اس کے سخت مخالف تھے۔ لاہور میں، مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجتماع' نواب شاہنواز (مرحوم) اور ان کے رفقاء کی شبانہ روز محنت و کاوش سے، پرشکوہ انداز سے منعقد ہونے والا تھا لیکن مخالفین کے سینے پر اس سے سانپ لوٹ رہا تھا۔ پہلے انہوں نے اس امر کی کوشش کی کہ کسی طرح یہ اجلاس ملتوی ہو جائے۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی، تو ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں پر گولی چلا کر ایسے حالات پیدا کر دیئے جن میں اس اجلاس کا انعقاد ناممکن ہو جائے۔ لیکن دوسری طرف وہ مردِ آہن تھا جس کے عزم و ارادہ کو کسی کی سازش متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اجلاس ہوگا اور ان تمام مساعی مذموم کے علی الرغم ہوگا۔ چنانچہ' یہ کاروانِ شوق قائداعظمؒ کی قیادت میں' ٹھیک پروگرام کے مطابق' دہلی سے روانہ ہوا۔ طلوعِ اسلام کا وفد' شریکِ کارواں[1] تھا۔ لاہور پہنچ کر اس نے کیا دیکھا' اس کی تفصیل طلوعِ اسلام کی اپریل ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے صفحات میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

"اللہ رے بساطِ سیاست کی فسونگرانہ مہرہ بازیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ وہائٹ ہال کے اربابِ حل و عقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک (لاہور) کی طرف لگ رہی تھیں۔ رام گڑھ[2] میں جمع ہونے والے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف' ہر بات کھٹکنے پر کھڑے ہو رہے تھے۔ انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خوابِ پریشاں بنتے نظر آ رہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جس کے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے، تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک جداگانہ حکومت کے تصورات میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے والی تھی۔ سرزمینِ پنجاب کا ایک ایک ذرہ ابھر ابھر کر ۲۱ مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نو کروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جاں فزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر

---

[1] اجلاس کے دوران طلوعِ اسلام کا کیمپ پنڈال سے باہر نصب رہا اور فارغ اوقات میں اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست کی بحث و تمحیص کا مرکز بنا رہا۔

[2] انہی تاریخوں میں کانگریس کا اجلاس رام گڑھ میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت کے لئے ہندوؤں نے خاص طور پر (مولانا) ابوالکلام آزاد کو منتخب کیا تھا۔

دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سماء سیاست پر ایک آفتاب تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ شپرہ چشم ہیروں کو اس آفتاب جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے حیرت انگیز نتائج اُن کے چہروں کو بے نقاب کر دینگے۔ صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں نے اسکے چہروں کی اس اُڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک سازش کا قاصد لاہور بھیج آگیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق کچھ کہنا تاحال ہم خبر نہیں۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرمجوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک، قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیفیت نشاط پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں، ولولوں نے کروٹ بدلی، تمنّائیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں۔ عزائم نے قدم بڑھایا، ارادوں نے کمر ہمت باندھی اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

اُدھر یہ گرمجوشیاں تھیں اور اِدھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے تبسم آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جا رہے تھے لیکن کیف و عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پس پردہ کا جائزہ لے لے۔ وقت گذرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے تصرف نامہ سے جماعتِ خاکساران پر پابندیاں عاید کرنے کے احکامات نافذ ہو گئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اس پر بھی نہ سمجھا کہ

ترے نشتر کی زدِ شریانِ قیس ناتواں تک ہے!

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساروں کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا۔ کہ جلوسِ ہند مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے، شام کے وقت یہ خبر آگ کی طرح اطراف و اکنافِ ہند میں دوڑ گئی۔ کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلادی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہو گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ساری آبادی پر جلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں، ہر متنفس متوحش۔ نہ باپ کو بیٹے کی خبر۔ نہ بھائی کو بھائی کا علم۔ کاروبار بند۔ دل پژمردہ۔ ہمتیں پست۔ دل افسردہ۔ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونے والوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست اسٹیشنوں پر بیٹھے، کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے، ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدر جلسہ دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں

تار پر تار آ رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہا ہے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے بعد میں بتایا، انہیں نہایت مخلصانہ مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور وحشت کے یہ سامان ایک طرف اور وہ عزم و ہمت کا پیکر دوسری طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز و تند موجیں اٹھتیں ہیں اور اس روشنی کے بلند و محکم مینار سے ٹکرا کر خاسر و نامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقع کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر و استقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔ اس نے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور ۲۰ مارچ کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا رد و بدل ہوگا۔ البتہ اس حادثۂ الم انگیز کے پیشِ نظر کہ جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانۂ حزن و ملال بنا دیا تھا جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے ۳ گھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم و استقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہو گیا۔

لاہور پہنچ کر قائداعظم نے کیا دیکھا، یہ تو ان کی چشمِ پرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جن کے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ایک فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لئے لوگ اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے جانبِ قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ چہرے اداس، دل پژمردہ، آنکھوں میں آنسو۔ شہر میں ہو کا عالم۔ ہر شخص ایک غیر محسوس خوف سے ہراساں۔ سینوں میں آہ و فغاں کا قیامت خیز تلاطم۔ لیکن حلق "قانونی" پابندیوں کی زنجیریں سینوں میں جکڑا ہوا۔ دل الم جانگداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ۔ لیکن لب "آئینی" قیود کی محیط رانہ بندش سے سربمہر کہ دھواں تک نہ نکلنے پائے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا پاس چلا بھی گیا تو ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامن گیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کی چشمِ حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو، چپکے چپکے اس کے غم و الم کی داستانِ خموش کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیل خانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسبان ہو۔ اِدھر اُدھر استقبال کے دروازے نیم تیاریوں کی حالت میں، دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں۔ گری ہوئی جھنڈیاں۔ ٹوٹے ہوئے قطعات، یوں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکان کے بقیہ آثار۔ کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز، دو دن کے لٹے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی تھی۔ کسی گھر سے

ضعف و نقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں، ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بن کر کنگورۂ عرش کو ہلائے جا رہی تھی۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اس کے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے، کسی گوشے سے زخمیوں کے کراہنے کی صدائے دردناک اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لئے کس قدر ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ مشہدِ خاکساراں کی خاک کے ذرات بے گناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگین تھا بظاہر سر مرنے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ۔۔۔ ان سب کے ساتھ ۔۔۔ شاہی مسجد کے مینارے کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے، غلطیدۂ خاک و خون، مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بن کر ذبح ہوتے دیکھا تھا، بحضورِ ربّ ذوالانتقام دست بدعا استادہ کہ اسے خدائے رؤف و رحیم! صدقہ اُس مردِ قلندرؒ کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے، سرزمینِ لاہور کو غرق ہونے سے بچالے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے جس نے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلا دیا۔

—— (٠) ——

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقینِ محکم و عمل پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلآویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسنِ تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حسن و خوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ ۲۱ مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص (قائداعظمؒ) نے آکر صرف اتنا ہی کہا کہ

> میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑوں۔ اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ۔ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری پوری دادرسی ہوگی۔ حق و انصاف کا بول بالا ہوگا۔

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدۂ لاہور پر نور کی کرنیں بن کر برسے جنہوں نے یاس و حزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاعِ امید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں ازسرِ نو روشنی پیدا ہو گئی۔ افسردہ چہروں پر خونِ نو کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے

کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے۔ اجتماعات پر جو پابندیاں عاید ہو چکی تھیں ان کی رسیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تپ دق کے جراثیم دور ہونے۔ قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (۲۲ مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہنواز خان صاحب صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے جو خواہ مخواہ سر درد یہ ستان یا درد ہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے "درخشندہ" کارناموں کا ذکر آیا تو ۱۹ مارچ کے حادثۂ غمزدہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین و لعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آگئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دلوں سے باہم منطا اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس کا دھواں تک بھی اوپر نہ اٹھنے پائے اس وقت اپنی پوری عنان تابی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا کہ حلق کے اوپر سے آوازیں اٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمقِ قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں جنہیں ستمگر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے پر نکلنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا اور چشم فلک عبرت و موعظت کے اس دل دوز منظر کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اس کے بعد ہوا کا رُخ بدل گیا۔ اب خوف و ہراس کا ردِّ عمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا، پورے جوش و خروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے "مردہ باد" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت و ملامت کی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ اس کا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے اِن باتوں کو اپنے کانوں سے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نفرت و ملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں خون شہداء کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلہ پر۔ کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو اسی کا۔ اور دو دن تک یہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اس ہنگامۂ بحث و جدل، اس سیلابِ جوش و خروش میں مسٹر جناح نے جس ہمت، استقلال، عزمِ راسخ، تدبر، صلاحیتِ ضبط و انضباط کا ثبوت دیا، آنے والا مؤرخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تامل پکار اٹھے گا کہ فی الواقع ایک "قائد اعظم" کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا "رہبرِ فرزانہ" مل جائے اور مستحق صد تحسین ہے۔

وہ انسان جسے مبدء فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہو جائیں۔ کامل دو دن تک یہی ہنگامہ رہا اور بالآخر ۲۴ کی شب آخری کھلے اجلاس میں جب کہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ مجمع کیا، جوش و جذبات کا بحرِ متموج تھا جو ہر متصادم عنصر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بر دہاں موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کرنا اسی صاحبِ ہمت مردِ دانا کا کام تھا جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرأت و حوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرما دے۔ صاحبِ صدر نے اس ریزولیوشن کو پیش کیا اور اس درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جس کے لفظ لفظ سے اُن کے قلبِ محزون کی تڑپ و خلش اُبلتی نظر آ رہی تھی۔ ریزولیوشن پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث و تمحیص ہو لیکن سب نے کہہ دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملّی راہ نما پر کس قدر اعتماد ہے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

لیگ کے اجلاس کی ابتدا اور اختتام میں کیفیات و جذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہو چکی ہے اور مسٹر جناح کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ لاہور کا حادثہ ہر دیدۂ بینا کو خون کے آنسو رُلا دینے کا موجب تھا۔ با ایں ہمہ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں ایک خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو نہ مسلمانوں کے ضبط و انضباط کا امتحان ہو سکتا نہ مسٹر جناح کی بلندیٔ مرتبت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا۔ نہ لوگوں کو اس حد تک محسوس ہو سکتا کہ مسلم لیگ ان کے مفاد کی کس درجہ محافظ ہے اور نہ ہی لیگ اور خاکسار ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ سکتے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس آخری شق میں استقامت پیدا ہو جائے تو شہدائے لاہور کی قربانی رائیگاں نہ گئی۔ ربنا الف بین قلوبنا واجعلنا بنعمتک اخوانا۔

———— (•) ————

خاکساروں سے متعلق جو ریزولیوشن پاس کیا گیا ہے وہ یقیناً اطمینان بخش ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ایک جزو سے تھوڑا سا اختلاف ضرور تھا۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ اگر حکومت سے یہ مطالبہ کرنے کے بجائے کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے، مسلم لیگ خود ایک آزادانہ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرتی اور لیگ کی مجلس عاملہ اس کمیٹی کی رپورٹ پر ضروری مواخذہ کرتی۔ بہر حال جو کچھ اجلاس نے منظور کیا وہ مسلمانوں کے اجتماع کا متفقہ فیصلہ ہے جس کے بعد ہمیں اختلاف کا حق حاصل نہیں رہتا۔ اب ہم اربابِ لیگ کی خدمت میں اتنا عرض کریں گے کہ وہ اس معاملہ کو اختتام تک پہنچا کر اطمینان کی سانس لے، یونہی ادھورا نہ چھوڑ دے۔ اور اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت وغیرہ

کا کام بھی صرف خاکسار ان، یا دیگر متعلقہ اشخاص کے ذمہ ہی نہ چھوڑ دے بلکہ اس میں خود بھی مدد کرے۔ لیگ کے ارباب بست وکشاد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کی خاطر اُن کی صد سالہ نرم وگرم کوششیں ایک طرف اور ایک بے گناہ مسلمان کا خونِ ناحق ایک طرف۔ خونِ ناحق کا پلڑا پھر بھی جھکتا رہے گا کہ

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا اَبَدًا۔

(جس نے کسی ایک مسلمان کو بھی عمداً قتل کر دیا، اس کی سزا جہنم ابدی ہے!)

ان کے اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام اعمالِ انسانی کا صحیح صحیح جائزہ لینے والا ہے۔

(۰)

اس ضمن میں ہمیں کچھ ضروری باتیں اپنے خاکسار بھائیوں سے بھی کہنی ہیں لیکن وہ ابھی نہیں۔ اسلئے کہ میت والے گھر میں یہ کہنا کہ علاج میں فلاں نقص رہ گیا ہے، ان کے زخمی دلوں پہ نمک پاشی کرنے کے مرادف ہے۔ زخم بھر جانے دیجئے۔ حالات درست ہو جانے دیجئے۔ یہ گزارشات پھر بھی کی جا سکیں گی۔ اس وقت سب سے مقدم تو اُن بے گناہوں کے خون کا مسئلہ ہے جس کی دیت تمام ملتِ اسلامیہ کے ذمہ آتی ہے۔ آج جس شخص نے اس خونِ ناحق کے خون بہا دلانے میں ذرا بھی کوتاہی کی، کسی قسم کی مصلحت کوشی نے اس کے دامنِ عدل کو اپنی طرف کھینچ لیا، ہمارے نزدیک اس میں اور ان ہاتھوں میں کوئی فرق نہیں جو ان شہیدوں کے خون سے رنگین ہیں۔ کسے باشد۔

خاکسار شہیدو! تم پر اللہ کی رحمت ہو!

(۰)

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو ۱۹ مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں اس قیامت سانحہ کے نتائج و عواقب کو اس حسن و خوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملّی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے، تو اس پر کس قدر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کے قوائے عملیہ کس بقدر مضمحل ہو چکتے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے کس قدر حزن و یاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں ایک رہبرِ فرزانہ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کر قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی

دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اس کی تگ و دو کا منتہیٰ کیا ہے۔ اس کے سامنے نصب العین کون سا ہے۔ لاہور کے اجلاس نے واضح اور بین الفاظ میں بتا دیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آ رہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں دوسرے حصہ ملک سے الگ کر کے ایک جداگانہ مملکت قائم کی جائے۔ صدر مسلم لیگ مسٹر جناح گزشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آ رہے تھے، دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ حتیٰ کہ ہم نے مارچ کے پرچہ میں مسٹر جناح کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا تھا، اس میں اس منزل کا پتہ نشان بھی کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا تھا۔ پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان ایک اقلیت یا فرقہ نہیں بلکہ ایک مستقل بالذات جداگانہ قوم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہندوستان ایک واحد ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے۔ پھر اور آگے بڑھے تو فرمایا کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانانِ ہند کے نزدیک قطعاً قابلِ قبول نہیں۔ جب یوں آہستہ آہستہ زمین تیار ہو گئی۔ جب قوم نے ایک مرکب کے مختلف عناصرِ ترکیبی کو یوں الگ الگ دیکھ لیا تو اس کے بعد ۲۲ مارچ کی سہ پہر اپنے خطبۂ صدارت میں اور اس کے بعد ۲۳ مارچ کے کھلے اجلاس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیا کہ مسلمانانِ ہند کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے، اپنی آزاد اور جداگانہ حکومت قائم کریں گے جہاں نہ انگریز کا عمل دخل ہو گا نہ ہندو کا اثر و تسلط۔ جب ایک واضح اور درخشندہ نصب العین سامنے آ جاتا ہے تو اس وقت قوم کے دلوں کی کیا حالت ہوتی ہے، یہ الفاظ میں نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس کا اندازہ تو اس چنڈال سے لگ سکتا تھا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فی الواقعہ مسلمان ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اس اعلان نے مسلمانانِ ہند کے تصورات کی دنیا کو بدل دیا۔ ان کے احساسات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہندوستان میں ان کی نشاۃِ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو دراندازیم

ذرا مارچ کے طلوعِ اسلام کو اٹھائیے اور "صبحِ امید" کے عنوان سے ہم نے جو کچھ لکھا تھا اُسے ایک بار پھر پڑھیئے اور دیکھیئے کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۳۰ء میں جو کچھ فرمایا تھا، کامل دس برس تک ادھر ادھر ہر چکر کاٹنے کے بعد ملتِ اسلامیہ کو وہیں آنا پڑا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ کوئی اور منزل ہی نہ تھی۔ یہ ہے فرق دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی میں۔ حضرت علامہ نے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم

سے طلب کیا۔ اور اللہ کی اس کتاب مبین نے انہیں وہ حل بتایا جو فطرت کے قوانین کی طرح اٹل اور غیر متبدل تھا۔ دنیا جہاں جی چاہے صحرانوردی اور دشت پیمائی کرتی پھرے اسے بالآخر ہار تھک کر قرآن ہی کی طرف آنا ہوگا جتنی جلدی آجائے اتنی ہی مفت کی پریشانیوں سے بچ جائے اور بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ ملت اسلامیہ نے اپنے نصب العین کے متعلق یہ اعلان اسی مرد حق آگاہ کے راحت کدہ کے سرہانے جاکر کیا ؎

اے باشاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بر بست و چشم ما کشاد

ہمیں افسوس اتنا ہوا کہ (سوائے ایک ڈاکٹر محمد عالم کے) اور کسی نے اس امر کا اعتراف بھی نہ کیا کہ یہ نظریہ، جسے ہم ملت اسلامیہ کا نصب العین قرار دے رہے ہیں، اس کا سرچشمہ کون سا ہے۔ یہ کس مرد خود آگاہ و خدا مست کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے۔ یہ کس مرد قلندر کی آہ نیم شبی و نالۂ سحری کا رہین منت ہے قوم اگر اس کا اعتراف کرتی تو خود قوم کے لئے باعث صد افتخار ہوتا اس لئے کہ وہ مرد مومن تو اس قسم کی مدح و ستائش سے مستغنی تھا۔ اس نے کبھی زندگی میں اس کی خواہش نہ کی۔ تو بھلا مرنے کے بعد اسے اس کی کیا ضرورت ہے، اس کا مقام ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے البتہ قوم اپنی احسان شناسی اور کشادہ ظرفی کا ثبوت دیتی۔ لیکن یہ مسلمانوں کی قوم ہے۔ یہ صرف کفر کے فتوے ہی لگانا جانتی ہے۔

اسی مقام پر ایک اور چیز بھی یاد آگئی۔ ارباب مسلم لیگ کے متعلق بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن سے قطعاً ناآشنا اور لابلد ہیں اس لئے ان کی حمایت کی تائید کس طرح جائز قرار پا سکتی ہے؟ ہم نے اپنے مسلک کی وضاحت میں کئی بار اس امر کی تصریح کی ہے کہ ہمیں بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ لوگ علوم قرآنی سے واقف نہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کا اصولی مسلک اصول قرآن کے مطابق ہے۔ اس لئے ہم اس مسلک کی تائید ضروری سمجھتے ہیں جس وقت اس میں کوئی چیز ایسی آجائے گی (دانستہ یا نادانستہ) جو قرآن کے خلاف ہوگی، سب سے پہلے ہم ہونگے جو اس کی مخالفت کریں گے۔ ہمارے اس مسلک کی تائید لیگ کے اس اجلاس سے بھی ہو رہی تھی جو ریزولیوشن لیگ نے پاس کیا۔ وہ کون سا مسلمان ہے جو کہہ سکتا ہے کہ وہ تعلیم قرآنی کے مطابق نہیں۔ لیکن اس ریزولیوشن کی تائید میں جس قدر دلائل پیش کئے گئے، وہ تمام آئینی و سیاسی تھے، قرآنی نہیں تھے۔ معترض کہے گا کہ دیکھئے لیگ کے تین دن کے اجلاس میں ایک دلیل بھی تو نصوص قرآنی سے نہیں دی گئی اسلئے اس جماعت کی مخالفت ضروری ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس تین دن کی بحث و تمحیص کے بعد لیگ نے جو نصب العین متعین کیا، اسے دیکھئے۔ وہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے لہذا اس مسلک کی تائید کیجئے۔ اب یہ بتانا کہ یہ مسلک کس طرح قرآنی تعلیم کے مطابق ہے، ہمارا

فریضہ ہے۔ یہ خوب ہوتا اگر خود لیگ کے اربابِ حل و عقد اس مسلک کو پیش کرتے وقت ہمیں یہ بتاتے کہ دیکھئے یہ مسلک کس طرح قرآنی اصولوں کے مطابق ہے۔ لیکن جب حالت یہ ہو گئی ہو کہ قرآنی اصولوں کو جاننے والے عین انہی دنوں رام گڑھ میں متحدہ قومیت کے سے غیر قرآنی نظریہ کو عین اسلام بتا رہے ہوں تو غنیمت سمجھئے کہ یہ قرآن نہ جاننے والے مسلمان وہ مسلک پیش کر رہے ہیں جو قرآن کے مطابق ہے۔ یہ مسلک کس طرح قرآن کے مطابق ہے اس کے خلاف جو اعتراضات عائد کئے جاتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اسکیم کس طرح قابلِ عمل ہے۔ اس سے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ مسلم انڈیا میں غیر مسلم اقلیتوں کی کیا حالت ہو گی — ؟ یہ تمام سوالات ایسے ہیں جن کے تفصیلی جواب کا یہ موقعہ نہیں۔ ان کے متعلق ہم دوسری اشاعت میں شرح و بسط سے بحث کریں گے۔ انشاء اللہ!

---

لیگ نے اس ریزولیوشن سے مسلمانانِ ہند کے سامنے ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دیا۔ اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا نصب العین، یقیناً ایک نئی زندگی کی تمہید ہے۔ اس امر کی مخالفت اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتی تھی لیکن ان صوبوں کے مسلمان نمائندوں نے جس وسعت اور کشادگیٔ قلب سے اس ریزولیوشن کی تائید کی وہ اس امر کا آئینہ دار تھا کہ مسلمان اب اس طرح اپنے انفرادی مصالح کو ملت کے کلی مصالح پر قربان کر دینے پر بسر و چشم آمادہ ہے۔ ہم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو اُن کے اس طرزِ عمل پر درخورِ ہزار مبارک باد سمجھتے ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے انہوں نے فی الواقع بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ لیگ کے اس ریزولیوشن کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمان جو اس وقت تک لیگ کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں اب اس بنا پر اس کی مخالفت جاری رکھیں گے! لیگ کا نصب العین واضح ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے اس نصب العین کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ پریس میں آ چکا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس ریزولیوشن نے ہندوؤں کو کس طرح آتش در پیرہن کر دیا ہے۔ مہاسبھائی اور کانگریسی نرم اور گرم سب بیک زبان اس کی سخت سے سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا یہی امر اس چیز کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ یہ نصب العین کس طرح مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ جس چیز سے شیطان ناراض ہو وہ یقیناً اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مسلمان کہلواتے ہوئے اس باب میں غیر مسلموں کی تائید کرتے ہیں۔ حق و باطل کے امتیاز کی یہ کیسی عمدہ کسوٹی ہے۔ آیئے اور خود امتحان کر لیجئے:

# بہ بیں تفاوتِ راہ ...... ..

ایک طرف ملّتِ اسلامیہ اپنے اس عزمِ بلند کا اعلان کر رہی تھی اور دوسری طرف دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کے گوشے میں بیٹھا ایک شخص چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا کہ مسلمانو! (یعنی اے پیدائشی مسلمانو!) دیکھنا! اس تحریک کے قریب مت جانا۔ یہ تمہیں لے ڈوبے گی۔ یاد رکھو!

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے اور اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائیگی' تو ان کا یہ گمان غلط ہے۔ دراصل اسکے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

یہ تمہارے لیڈر، یہ ان کا قائدِ اعظم! یہ تمہیں اسلامی مملکت بنا کر دینے کا چکمہ دیتے ہیں۔ یاد رکھو!

ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی جھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

...... قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو...... انہیں اسلام کا نام استعمال کرنے کا بھی حق نہیں...... یہ آزادئ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سروں میں امپیریلزم کی مخالفت سب بکری کی بولیاں ہیں۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمان اس وقت دوست اور دشمن میں تمیز کرنا سیکھ چکا تھا۔ اس لئے کسی نے بھی ان ہفوات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور یہ کاروانِ شوق کشاں کشاں جانبِ منزل رواں دواں رہا اور بالآخر پاکستان آ پہنچا۔ ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی میں کم از کم اتنی غیرت تھی کہ انہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تو وہیں ہندوستان ہی میں رہے اور وہیں کی خاک میں پیوستہ ہوئے۔ لیکن یہ بزرگوار (امیر جماعتِ اسلامی) پاکستان بنتے ہی یہاں آ دھمکے اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے تیئس سال سے مسلسل یہاں خلفشار برپا کرنے میں مصروف ہیں اور تماشہ یہ کہ اس کے ساتھ کمال ڈھٹائی سے پکارتے چلے جاتے ہیں کہ میں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

(بزم)

# اُردو زبان میں نماز

## پرویز

(۱۹۵۵ء کا ذکر ہے کہ لاہور میں یہ تحریک اٹھی کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جایا کرے۔ چونکہ یہ تحریک قرآن کے خلاف اور بڑے خطرناک، دُور رس نتائج کی حامل تھی اس لئے طلوعِ اسلام نے اس کی سخت مخالفت کی اور ملک بھر میں اس کے خلاف جدوجہد کی جس سے یہ فتنہ سرد ہو گیا۔ اس سلسلہ میں محترم پرویز صاحب نے ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا (اور اب ان کے مجموعہ مضامین۔ سلسبیل۔ میں شامل ہے)

پچھلے دنوں پھر اس تحریک کی صدائے بازگشت سنائی دی ہے جس کے لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ پرویز صاحب کا محولہ بالا مقالہ دوبارہ شائع کیا جائے۔ اس مقالہ میں، زیر نظر موضوع کے علاوہ ایک اور اہم نکتہ بھی زیرِ بحث آ گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا قرآن کریم کے الفاظ بھی منزل من اللہ ہیں یا اس کا صرف مفہوم وحی کی رو سے عطا ہوا تھا جسے رسول اللہؐ نے اپنے الفاظ میں دوسروں تک پہنچایا تھا؟ اس نکتہ کی اہمیت بھی واضح ہے اور ہمیں امید ہے کہ قارئین اس کا مطالعہ پورے غور و فکر سے کریں گے۔ طلوعِ اسلام]

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اُردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آ جاتا ہے کہ کیا قرآن، عربی زبان کے بجائے اردو زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر، کیا قرآن کا ترجمہ (اردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے دیگر الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا کھلا ہوا اور دوٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کے اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ کوئی اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض گوشے

مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا کی طرف سے نبی اکرمؐ کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہوا تھا۔ الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو اُن لوگوں کی زبان میں بیان فرما دیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں، وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر لیں تو یہی

**ایک غلط خیال**

قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔ یعنی —— نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ بحث کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبوی پر وحی ہوا تھا یا اس کے الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں، بڑی شدید بحث کا موضوع بن گئی تھی لیکن ایک تو اس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب اس سوال کو اٹھایا ہے وہ قدامت پرست طبقہ سے متعلق نہیں، بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق ہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان سے اِن کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ ان کے سامنے حقیقت واضح طور پر آ جائے۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے

**وحی کا انکار**

اپنے خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہے، لیکن چونکہ آپ نابغہ (GENIUS) واقع ہوئے تھے اس لئے ایک (GENIUS) کی طرح آپ (معاذ اللہ) یہی سمجھتے تھے کہ —— آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں —— ان لوگوں سے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس قسم کا خیال وحی اور قرآن کا کھلا ہوا انکار ہے جس کے بعد کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جس میں نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا کوئی دخل نہیں۔

**الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق**

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے القا ہوتے تھے لیکن ان خیالات کو حضورؐ اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سرِدست ہمارا مخاطب ہے۔ انہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے "ضربِ کلیم" میں "جان و تن" کے عنوان کے ماتحت کہا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنی۔ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انہوں نے، نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے، اُس فلسفیانہ بحث کو سمو دیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انہوں نے اپنے خطبات (خطبۂ اوّل) میں بھی

ضمنی طور پر چھیڑا ہے وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

مبہم اور بے زبان احساس (FEELING) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل (IDEA) کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور تخیل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں، احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم کا نقص ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے لئے آپ شکل پیدا کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر بک (R.M.BUCKE) اپنی مشہور کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں تصور (CONCEPT) اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا ...... کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو۔ اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (صفحہ ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M.URBAN) نے اپنی کتاب (HUMANITY AND DAITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان (INTUTION) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروشس (CROCH) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے ...... یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے؛ وہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے (صفحہ ۵۳) اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (صفحہ ۲۹۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ

جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا (صفحہ ۵۴۴)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطورِ مثال پیش کیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کر کے وہ بات پیدا ہی نہیں کرسکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق، قرآن کے اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزل من اللہ کتاب ہے۔ یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر چٹانیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

## عربی زبان کی وسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی وسیع، گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم السنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی (حتیٰ کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر بک کی جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میری لغات القرآن" میں آچکی ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت و حکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسمٰعیل کے ذمے (گویا) یہ فریضہ عاید کر دیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOP) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا، قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں؟ بدل ہونا تو ایک طرف۔ قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔

## قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گب (H.A.R. GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں۔

جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا، قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوتے ہیں جس طرح کسی حسین و جمیل تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ و خم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا ایک طویل مدت تک، نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط و الوان ہی کا نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرنے میں اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اڑنے والے شاہین کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں، ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو۔ اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے۔ اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابی دقتوں کو بھی لے آئیں (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جا

ممکن ہو۔ تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں - بے ہنگم سا اثر ہوگا۔ مثلاً قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَ نُمِيتُ وَ اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۵۰/۴۳)۔ انگریزی کیا دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔

( MODERN TRENDS IN ISLAM P.4 )

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام! آپ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں؟ اس کا تجربہ

## ہمارے تراجم کا اثر

آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ گب جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر و جذب کا ایک حشر برپا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ قٓ کی اسی آیت کو لیجئے جسے گب نے پیش کیا ہے وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آ رہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تحقیق ہم جِلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے۔

VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO US IS THE JOURNEYING.

اسی قسم کے تراجم، مارماڈیوک پکتھال۔ محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے گب کے دل پر ہوا ہے؟

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے تخیل طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی کسی طرح نہ اصل کا بدل ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر ٹوئن بی اپنی کتاب AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION میں لکھتا ہے۔

عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں ... اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانہ مابعد کی سائنٹفک

تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہٰذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی تو مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قیود سے ماوراء تھیں۔ (صفحہ ۲۶)

لہٰذا قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں بیان کیا جائے وہ وقتی ہو سکتا ہے ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں قرآن کی آیات آنی چاہئیں۔ وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے ہی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جاسکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے کسی دوسری زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

---

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آجکل پڑھی جارہی ہے اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یونہی دہرائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں جن کا ہم مطلب سمجھتے ہوں؟

**بلا سمجھے الفاظ کا دُہرانا** اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں وہ نماز بے مقصد اور بے روح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴/۴۳) "اے ایمان والو! تم جب نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک تم یہ نہ جانو کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔ اس آیت میں حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ سے اس حکم کی علتِ غائی سامنے آجاتی ہے یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے ان کے دُہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔[1] یہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تو پھر ان الفاظ کی جگہ اردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟

---

[1] میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے بوجھے دُہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

**سر درد کا علاج**

ایسا کہنے کے معنی یہ ہیں کہ درد سر کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا ہے۔ سر درد کا علاج، سر کا کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اس علت کا ازالہ ہے جو سر درد کا موجب ہے یعنی اس جہالت کا دُور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معانی نہیں سمجھے جاتے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو[ل]۔

(۲) ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳) ثانوی سے آخر تک، عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

---

**عربی - اُردو نماز**

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً

(۱) اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے علاوہ باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کر لیں گے کہ امام کی عربی قرأت کے ساتھ اُردو کے الفاظ بولتے جائیں۔ لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی؟

(۲) نیز جن نمازوں میں۔ یا فرضوں کی جن رکعتوں میں، قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی، ان میں اردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا؟ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ایسا ہوگا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اردو ترجمہ پکار کر کہے؟

(۳) یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے امت میں

**نئی نماز**

ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہوگا جو ان تمام (مزعومہ) فوائد کو لے ڈوبے گا جس کے پیش نظر آپ اس جدت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ اور شرک جرم عظیم۔ ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے۔ اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے تو خود اس فرقہ کا وجود معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے وہیں اس سے بچنے کے لئے "وحدتِ صلوٰۃ" کا ذکر کر دیا ہے۔ سورہ روم میں ہے..... وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۔ مِنَ الَّذِیۡنَ

---

ل۔ قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی۔ لیکن آغازِ کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اٹھ جائے گا۔

فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲) تم صلوٰۃ قائم کرو۔ اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

**میرا مسلک** یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ، اس کی شدت سے تاکید کرتا چلا آ رہا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جا رہی ہے اس میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے ردوبدل سے مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا[1]۔ وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ امت لازم و ملزوم ہیں، اور وحدتِ امت، صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا کسی فرد یا گروہ کا، نماز میں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، امت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں حضرت ہارونؑ نے کچھ وقت کے لئے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا (دیکھئے ۲۰/۹۴)۔ لہٰذا جو لوگ نور دن دن۔ تین نمازوں یا نماز اُردو یا اُردو عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ الٹا اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو اس کے پتوں پہ پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی قوم کی جہالت دُور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

پرویز

---

[1] آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ ہم سے ان کا مقصد واضح ہے اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے!

# نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

پرویز

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے۔ وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کر سکتا ہے۔ وَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ خود خدا کا ارشاد ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی کا دار و مدار اسی خصوصیت پر ہے لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں، سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعین ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، اور ایک ہی لفظ کے معانی مختلف افراد مختلف لیں، تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے۔ مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بیہوشی کے عالم میں، شدتِ پیاس سے کہیں۔ پانی ــــ اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیا لئے چلا آ رہا ہو اور کوئی کرمچھا۔ ایک آپ کے سرہانے تولیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی، کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو ــــ سوچئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوتِ گویائی) کسقدر عذاب بن جائے۔ یہ نعمت اسی صورت میں برقرار پائے گی کہ جب آپ "پانی" کہیں تو ہر سننے والا اس سے "پانی" مراد لے۔

یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھائیے اور سوچئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعین مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سمجھنے کے لئے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیئے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا جسے اِسلام کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعین تھا کہ موافق، مخالف، ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص کی زبان پر اسلام ہے لیکن ہر شخص کے نزدیک اس کا مفہوم جداگانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعین مفہوم سے امتِ واحدہ تھی، فرقوں میں

بٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے آئے گا لیکن ان میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر ایک اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا اور ہر فرقہ دوسرے کے دعوے کی تکذیب کرتا تھا۔ ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے۔ آج بھی مسلمانوں میں بیسیوں فرقے ہیں اور ان سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں۔ اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا ہے اور کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کا دعائے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا مظاہرہ ہم منیر کمیٹی کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے۔ اور جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر لفظ اسلام کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے۔ قرآن کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین حیات (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین — یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم!

تشتت و انتشار کے عذاب میں گرفتار قوم کی ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ کبھی ان خرابیوں کے ازالہ کی فکر کرے تو بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کے علل و اسباب پر غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، وہ ان میں ایک اور خرابی کا اضافہ کر لیتی ہے — جیسے فرقہ بندی کی خرابیوں کو دور کرنے کے خیال سے اٹھنے والا ایک نیا فرقہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے، اور پارٹیوں کے پھیلائے ہوئے فسادات کو مٹانے کا دعویدار ان میں ایک اور پارٹی کا اضافہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ لفظ اسلام کے مفہوم کے عدم تعین سے گھبرا کر قوم نے (بجائے اس کے کہ وہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے) اب ان اصطلاحات میں ایک اور اصطلاح کا اضافہ کر لیا ہے اور وہ اصطلاح ہے — نظریۂ پاکستان — اس جدید اصطلاح کو وضع کئے (یا اختیار کئے) کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے بھی اتنے ہی مفہوم ہو گئے ہیں جتنے مفاہیم لفظ اسلام کے تھے۔ اب ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی مدعی ہے اور ہر پارٹی دوسری پارٹی سے اس بنا پر برسرِ پیکار

کہ نظریۂ پاکستان کے حامل ہم ہیں، فریقِ مخالف نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

(۰)

پولیٹیکل سائنس (علم السیاسیات) کی رُو سے مملکت (STATE) سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد ایک بحیثیتِ اجتماعیہ (انفرادی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنے) کا تہیہ کر کے ایسا نظم و نسق قائم کریں جس سے وہ ملک مستحکم ہو اور اس کے باشندے خوشحال اور ہر قسم کے خطرات سے مامون — اس مملکت کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ افرادِ مملکت کا تصورِ زندگی کیا ہے اور نظریات و معتقدات کس قسم کے۔ یہ افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی مملکت کو قومی یا وطنی مملکت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس' مملکت' کا ایک تصور قرآن نے دیا تھا اور وہ یہ کہ ایک قسم کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی رکھنے والے افراد' اپنی منفرد حیثیت اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں۔ (ہمارے زمانے میں' کمیونزم کے حاملین نے اس تصورِ مملکت کو اپنایا ہے)۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں' ہندوؤں کے پیشِ نظر ایک قومی یا وطنی مملکت کا قیام تھا۔ اس کے برعکس' تحریکِ پاکستان کے پیشِ نظر اس قسم کی مملکت کا قیام تھا جس کا تصور قرآن نے دیا تھا۔ اس کا صحیح نام تو قرآنی مملکت تھا لیکن غیر مسلموں کو سمجھانے کے لئے (نیز اسے تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز کرنے کے لئے)' پہلے علامہ اقبالؒ نے اور اس کے بعد قائد اعظمؒ نے' اسے نظریاتی مملکت (IDEOLOGICAL STATE) کہہ کر پکارا ــــ یعنی وہ مملکت جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہو گی۔ اسی سے نظریۂ پاکستان (IDEOLOGY OF PAKISTAN) کی اصطلاح وجود میں آئی۔ یعنی ایسی مملکت جو میرے' آپ کے' یا ہندوستان میں بسنے والے افراد کی اکثریت کے' یا وہاں کی پوری آبادی کے' ذاتی خیالات یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہو گی بلکہ قرآنی اقدار کے فروغ اور برومندی کے لئے' وجود میں لائی جائے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے' ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ میں ان مقامات میں' اسلام' کی جگہ' قرآن' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ میں ایسا عمداً کر رہا ہوں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے) لفظ "اسلام" کا مروجہ مفہوم' متعین نہیں رہا۔ اس لئے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعین مفہوم آتا ہے' اور نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی متعین کرنے کے لئے کس طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے برعکس' جب لفظ "قرآن" استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لئے ابدی راہنمائی کا ذریعہ۔ لہٰذا' اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں' "قرآن" کے لفظ سے کم از کم توجہات ایک

مرکز پر تو مرکوز ہو جاتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ میں اسلام کے بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتا ہوں' ورنہ اگر صدر اول کی طرح اسلام کا متعین مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا۔ اسلام اس نہج زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے' اس کے نظریۂ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم نہ آنے پائے' اس لئے قرآن کا نام سامنے لانے سے ان کی طرف سے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بے شک ایک متعین کتاب کا نام ہے لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعین نہیں۔ اس کی تعبیر الگ الگ کی جاتی ہے لہٰذا اس سے بھی انتشار اور خلفشار کی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو لفظ "اسلام" سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے۔ اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دیدے' تو وہ کتاب الٹا کر پھینک دینے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے تو ایک ایسی کتاب جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں' بلکہ انسانوں سے بلند و بالا' خود خدا کی تصنیف ہے' کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ مختلف اور متضاد معانی دینے کے قابل (CAPABLE) ہوں'؟ بالخصوص جب اس کا دعوےٰ یہ ہو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں — اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ اس میں غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ اگر یہ کتاب خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے — سوچئے کہ جس کتاب کا بنیادی دعوےٰ یہ ہو کیا اس کی کیفیت یہی ہوگی کہ وہ ہر ایک کو الگ الگ تعلیم دے؟

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ایک حصہ وہ ہے جس میں اس نے انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی دی ہے۔ انہیں اصول حیات یا مستقل اقدار کہا جائے گا — یہ اصول و اقدار

بالکل واضح اور متعین ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا۔ امورِ مملکت کا تعلق اسی گوشہ سے ہے۔ قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق حقائق کائنات اور مابعد الطبیعیاتی مسائل (META-PHYSICS) سے ہے۔ ان حقائق کے سمجھنے کا مدار انفرادی فکر اور بہ حیثیت مجموعی انسانی علم کی سطح پر ہے۔ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائینگے اور کوئی شخص جسقدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا، وہ انہیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۔ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوٰت (زمین اور دیگر اجرامِ فلکی) کو پیدا کیا۔ اور ان میں ذی حیات کو پھیلا دیا اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، زمین اور ان اجرام کے ذی حیات کو اکٹھا کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا مفہوم آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اور لیا جاتا تھا اور آج (بالخصوص تسخیرِ قمر کے بعد) اس کا مفہوم واضح ہوتا چلا جا رہا ہے اور جس دن کسی اور کرہ کے ذی حیات (خواہ وہ جراثیم ہی کیوں نہ ہوں) زمین پر لائے جائینگے تو اس آیت کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ اسی قسم کے حقائق ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے آنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ..... (۴۱/۵۳)۔

ہم انہیں، خارجی کائنات اور خود ان کی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائینگے۔ تا آنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

یوں ان حقائق کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ان نشانیوں کے بے نقاب ہونے کے بعد بھی، ان کا مفہوم ہر شخص کی علمی اور فکری استعداد کے مطابق اس کی سمجھ میں آئے گا۔ اس کے لئے (عربی زبان سے واقف ہونا بے شک ضروری ہوگا لیکن) محض اس زبان سے واقف ہونا کافی نہیں ہوگا — آج کتنے لوگ ہیں جو انگریزی زبان کا علم رکھنے کے باوجود، آئن سٹائن کی اصطلاح (RELATIVITY) کا صحیح مفہوم سمجھ سکنے کے قابل ہیں!

لیکن یہ شرائط بسیط حقائق کے مفہوم سے متعلق ہیں۔ جہاں تک انسانی زندگی کی راہ نمائی اور امورِ مملکت کا تعلق ہے، قرآنی اصول و اقدار کا مفہوم متعین اور واضح ہے۔ جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا کہ ۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے ۔ تو فرمایئے کہ اس اصول کا مفہوم سمجھنے میں کس قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے؟ (یاد رکھیئے۔ قرآن اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا پروگرام ہر دور کی قرآنی مملکت خود متعین کرتی ہے)۔

لہٰذا اگر نظریۂ پاکستان (یا اسلامی مملکت کے اصول و مبانی) کا تعین قرآنِ کریم کی رُو سے کیا جائے تو اس کے مفہوم میں نہ کوئی الجھاؤ یا ابہام رہ سکتا ہے نہ اختلاف یا تضاد پیدا ہو سکتا ہے۔

(۸)

قرآن کریم کی رُو سے اسلامی مملکت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس در ایں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں حکومت صرف خدا کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اصول وضاحت طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود حکومت کرنے کے لئے سامنے نہیں آتا۔ اس لئے خدا کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟ ایک حکومت تو شخصی ہوتی ہے یعنی مملکت کا پورا اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جو حکم دے اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی مملکت میں نہ کوئی شخص یہ جان سکتا ہے کہ اس (صاحبِ حکومت) نے کل کو کیا حکم دے دینا ہے نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وہ حکم کیوں دیا ہے۔ اس اندازِ حکومت کو ملوکیت کہا جاتا ہے۔ قرآن اس قسم کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا، اس لئے "خدا کی حکومت" کبھی ملوکیت کے انداز کی نہیں ہوتی۔ دوسرا اسلوبِ حکومت یہ ہے کہ اطاعت قوانین کی ہو اور قوانین کی غرض و غایت اور علت و حکمت کا ہر ایک کو علم ہو۔ قرآن اسی نہج کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے ایک ضابطۂ قوانین دے دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان قوانین کی حکمت اور غایت کیا ہے۔ اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اطاعت کا نام خدا کی محکومیت ہے اور یہی مومن اور کافر کا امتیازی نشان ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اور اس کے بعد خود رسول اللہ سے ارشاد ہوا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔ (۵/۴۸)

(اے رسولؐ!) تو ان لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت کر (ان کے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کر) اور جب یہ کتاب (الحق) تمہارے پاس آچکی ہے تو پھر انسانوں کے خیالات اور آراء کا اتباع مت کر۔

یہ ہے خدا کی حکومت قائم کرنے (یا اس کی حکومت اختیار کرنے) کا عملی طریقہ۔ یعنی قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کا آئین قرار دینا اور اس کے قوانین و ضوابط کو ملک میں نافذ کرنا۔ یہ وہ بنیادی حقیقت تھی جس کا اظہار قائداعظمؒ نے ان الفاظ میں کیا تھا جو نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین کرتے ہیں اور جس مقصد کے لئے انہوں نے حصولِ پاکستان کے لئے اس قدر جد و جہد کی تھی۔ یہ الفاظ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اور نیشنل پریس اوف انڈیا نے انہیں نشر کیا تھا اور (علاوہ دیگر اخبارات) انقلاب (لاہور) نے انہیں چھاپا تھا۔ الفاظ یہ تھے۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ ہے نظریۂ پاکستان۔ یعنی حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں اور اسکی عملی شکل یہ ہے کہ مملکت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب کے اصول و احکام کی رُو سے متعین ہوں۔ یا الفاظ دیگر نظریۂ پاکستان سے مراد ہے قرآن کی حکمرانی۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے "نظریہ" کا لفظ بھی موزوں نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں نظریہ انگریزی زبان کے لفظ (THEORY) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو عمل (PRACTICE) کے بالمقابل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نظری مسائل کہا ہی ان مسائل کو جاتا ہے جن کے متعلق محض لفظی بحث ہوتی رہے۔ اور وہ عمل میں نہ لائے جائیں۔ اسی لئے، دنیائے عمل میں نظریہ کا لفظ مستحسن معانی میں استعمال نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ:

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب!

وہ (ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں) اس قسم کے مسائل کو "الٰہیات کے تراشے ہوئے لات ومنات" کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں امت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نظریہ (THEORY) کی طرح آئیڈیالوجی کا لفظ بھی دنیائے عمل میں مستحسن قرار نہیں پاتا۔ یہ بھی ایک تخیلاتی تصور ہوتا ہے جو عمل میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ (IDEALIST) کہا ہی اسے جاتا ہے جس کی یہ کیفیت ہو کہ۔ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار۔ اقبالؒ نے جب (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو سیاستین نے اسے یہ کہہ کر نا قابلِ اعتنا قرار دے دیا تھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے جس کا دنیائے ممکنات سے کوئی تعلق نہیں۔ خود مغرب میں بھی (IDEALISTS) کا لفظ تصورات کی دنیا میں بسنے والوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ قرآن نے اس کے لئے "کلمۃ اللہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسا بنیادی اصول جس میں نشوونما پاکر محسوس پیکر اختیار کر لینے کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ جب بدر کے میدان میں کفر اور اسلام کا پہلا عملی تصادم ہوا ہے تو اس کی غرض وغایت کے متعلق کہا۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ - (۹/۴۰) تاکہ ان لوگوں کا کلمہ جنہوں نے صداقت سے انکار وسرکشی کی راہ اختیار کی ہے مغلوب ہو اور خدا کا کلمہ غالب آجائے۔ اس لئے کہ یہ کلمہ وہ ہے جو حکمت اور قوت پر مبنی ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جسے سورۂ ابراہیم میں ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھایا گیا ہے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً کی مثال یوں سمجھو۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴/۲۴) اس پھلنے پھولنے والے درخت کی طرح جس کی جڑیں محکم ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھول رہی ہوں۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴/۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں پھل دے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں کلمۃ اللہ کی کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں! وہ نہایت مضبوط جڑوں والا تناور درخت ہے جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے۔ یعنی وہ محض ایک نظری مسئلہ یا تخیلاتی تصور نہیں۔ وہ ایک ایسا فارمولا ہے جو عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کے دعویٰ کی صداقت اس کے محسوس نتائج سے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے برعکس کلمۃ خبیثۃ (۱۴/۲۶) ہے جس کی کیفیت اس پودے کی سی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ہوا کے ذرا سے تیز جھونکے سے اکھڑ جائیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کریم نے دین کی اساس وبنیاد اس حقیقت کو قرار دیا ہے کہ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے اس نے ایک جامع فقرہ استعمال کیا ہے

اور وہ ہے ـــ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ـــ دنیا میں کوئی ہستی (شخص، گروہ یا ادارہ) ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے بجز اللہ کے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے ـــ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری ـــ اس انقلاب انگیز اساسی پیغام کا جو ترجمہ آج کل کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی شے یا ہستی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے، تو یہ تصور اُس دور کا پیدا کردہ ہے جب اسلام کو دین کی سطح سے اتار کر، مذہب کی سطح پر لا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ دین میں الٰہ سے مراد، صاحبِ اقتدار و اختیار ہوتا ہے۔ مذہب میں اس کا مفہوم "پرستش کی شے" ہو جاتا ہے۔ اسلام کا اساسی اصول، لا الٰہ الا اللہ کے مختصر لیکن بے حد جامع الفاظ میں مرتکز ہے اور اسی کو کلمہ یا کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــ جب دین میں اسے کلمہ کہا گیا تھا تو اس سے جو عملی نقشہ سامنے آتا تھا اس کے متعلق قرآنی تصریحات اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہی کلمہ ایک رسم بن کر رہ گیا، یا زیادہ سے زیادہ علم الکلام کا ایک مسئلہ۔ (یا اہلِ تصوف کا سرِ باطن، جنہوں نے 'وحدت الوجود' کے فلسفہ کی رُو سے اس کے معنی یہ کر دیئے کہ دنیا میں کوئی معبود ایسا نہیں جو خود خدا نہ ہو۔ یعنی انسانوں نے جتنے معبود تراش رکھے ہیں وہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔) بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے اساسی اصول کو لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ، قرآن مجید کے احکام و اصول و اقدار کو حاصل ہوگا۔

لیکن ہمارے ہاں، جو حضرات اسلامی حکومت کے قیام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے مدعی ہیں (اور آج کون ہے جو اس کا مدعی نہیں) ان میں سے کوئی بھی اس اساس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسلئے کہ اس اساس پر اُمتِ واحدہ کی عمارت استوار ہوتی ہے جس میں نہ مذہبی فرقوں کی کوئی گنجائش ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں کے لئے کوئی جگہ ـــ نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر علاقائی تفریق روا رکھی جا سکتی ہے اور نہ نسلی امتیاز کی بنا پر کوئی تمیز۔ اس میں ساری کی ساری اُمت، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی (حزب اللہ) ہوتی ہے جس کے اندر فرقہ سازی، یا پارٹی بازی، یا اسی قسم کی کوئی اور تفریق، شرک سمجھی جاتی اور حکمتِ فرعونی قرار پاتی ہے۔ (۲۸/۴) یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات (لفظ اسلام کی طرح) "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ کو تو اس شد و مد سے دہراتے رہتے ہیں لیکن اس کا متعین مفہوم کبھی پیش نہیں کرتے۔ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں میں الجھی اور کھوئی ہوئی قوم، توحیدِ خالص کیطرف آنا ہی نہیں چاہتی۔ قرآن کے الفاظ میں ـــ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (۳۹/۴۵) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت کے منکر ہیں "خدائے واحد" کا تصور پیش کیا جاتا ہے تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور جب خدا کے علاوہ اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ اہلِ جہنم سے کہا جائے گا کہ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ کَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ یُّشْرَکْ بِہٖ تُؤْمِنُوْا۔ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم اس سے انکار کرتے تھے۔ اور جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا تو تم اس اسلوبِ حکومت کو صحیح تسلیم کر لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی (۴۰/۱۲) کہ فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (۴۰/۱۲)۔ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ وہی علو اور کبریائی کا مالک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَہٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِہِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶)، جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نفرت آگیں انداز سے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں چنانچہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی قرآنِ خالص) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست حلقہ گوارا کرتا ہے نہ مغرب زدہ طبقہ ـــــ نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری ـــــ کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور ان کے فرقے اور پارٹیاں باقی نہیں رہتیں۔ لیکن ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ یہ اپنے اس شرک کا اعلان یا اعتراف کریں۔ اس کے لئے انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام یا نظریۂ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے۔ انہیں مبہم رکھا جائے۔

ہمارے ہاں یہ شعر جو زبان زدِ خلائق ہے کہ

پاکستان کا مطلب کیا ـــــ لا الٰہ الّا اللہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآن کریم کی رو سے اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن بات اس نے پتہ کی کہی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان (یا اسلامی مملکت) کی اساس لا الٰہ الّا اللہ ہے۔ اور اس سے مراد ہے ـــــ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی ـــــ اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است ـــــ یہی نظریۂ پاکستان سے مراد ہے۔

(⁂)


## پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کیلئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائے گی۔ سہ سالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

محمد رفیع اللہ

# مذہبی القاب کی شرعی حیثیت

اہل علم حضرات امام النووی رحمت اللہ علیہ کے مرتبہ سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا ایک ایک سانس خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آپ کی ان دینی خدمات کی وجہ سے جب آپ کے معاصرین نے آپ کو "محی الدین" کے لقب سے پکارا تو آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

إِنِّیْ لَا أَجْعَلُ أَحَدًا فِیْ حِلٍّ مِمَّنْ يُسَمِّيْنِیْ بِمُحْيِ الدِّيْنِ۔ (المدخل لابن حاج ص۱۲۳)

جو کوئی مجھے محی الدین کے لقب سے پکاریگا میں اسے کبھی معاف نہیں کرونگا۔

امام صاحب نے اس لقب پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس لئے فرمایا تھا کہ اس سے شرعی تقدس کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن آپ کی وفات کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ علماء کی مجالس اسی قسم کے مختلف القابوں سے گونجنے لگیں۔ محی الدین۔ محی السنۃ، نجم الاسلام، شمس الدین۔ قامع البدعۃ، زکی الدین، شمس الاسلام۔ نعمان ہذا الزمان، جامع صفات ریاضیہ وعقلیہ۔ حاوی اصناف فنون نقلیہ۔ واقف اشاراتِ صوفیہ۔ شمس الہدایت وغیرہ وغیرہ۔

مولوی۔ مولانا۔ صوفی۔ حاجی کے الفاظ بھی کچھ اسی قبیل سے ہیں کیونکہ ان کے استعمال میں بھی کسی نہ کسی حد تک مذہبی تقدس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کثرتِ استعمال سے ان کے اصلی معانی بڑی حد تک گھس چکے ہیں اور ان کا چلن اب کھوٹے سکوں سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

مذہبی القاب کی اس بدعت نے جب زیادہ رواج پکڑنا شروع کیا تو علمائے حق نے ان کیخلاف آواز اٹھائی۔ انہی میں سے ایک مقتدر ہستی علامہ ابن الحاج ہیں جنہوں نے اپنی مشہور کتاب المدخل کی پہلی جلد میں اس موضوع پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ اس بحث میں انہوں نے تقدس اور پاکیزگی کے حامل اسماء اور القاب کی شرعی حیثیت بڑی عمدگی سے بیان کی ہے۔ طولِ مبحث سے بچنے کے لئے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم زیادہ تر اس بحث کے ان حصوں کو نقل کرینگے جو القاب سے متعلق ہیں۔

## القاب کی حقیقی و غیر حقیقی صورت

علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان مذہبی القاب کی دو صورتیں ہیں ایک حقیقی اور دوسری غیر حقیقی۔ حقیقی یہ ہے کہ کسی دینی لقب کی متعلقہ صفت ملقب میں فی الواقعہ پائی جائے۔ جیسے محی الدین کہ وہ واقعی دین اسلام کو زندہ کرنے والا ہو۔ اور غیر حقیقی وہ جب صورت اس کے برعکس ہو یعنی ملقب کو لقب سے وابستہ صفات سے کوئی نسبت رہی نہ ہو۔

## اہل بدعت کی ابتداء

علامہ صاحب ان القاب و اسماء کے مروج ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں (صفحہ ۱۲۱) کہ جب ترک خلافت عباسیہ پر چھا گئے تو انہوں نے خلیفہ کو تو عباسی خاندان ہی سے رہنے دیا لیکن حکومت کی باگ ڈور ان کے مختلف سرداروں نے سنبھال لی۔ خلیفہ کی طرف سے ان سرداروں کو ان کے مرتبے کے لحاظ سے مختلف قسم کے القاب مثلاً شمس الدولہ، ناصر الدولہ، نجم الدولہ وغیرہ سے نوازا گیا۔ حکمران طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ اسماء و القاب عظمت و فخر کا نشان سمجھے جانے لگے۔ یہ قدرتی امر تھا کہ عامۃ الناس بھی ان میں دلکشی محسوس کریں۔ لیکن حکومت میں عمل دخل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے ان القاب کا حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس کی تلافی انہوں نے مذہب کے راستے سے کی۔ یعنی شمس الدولہ نہ سہی تو شمس الدین ہی سہی۔ چنانچہ اکثر لوگوں نے اپنی اولاد کے اسی قسم کے نام رکھنے شروع کر دیئے۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ ان اسماء و القاب کی خاصی وقعت تھی اس لئے حکومت نے اس پر پابندی عاید کر دی۔ چنانچہ جو کوئی اپنی اولاد کو ان ناموں سے موسوم کرنا چاہتا تھا اس کے لئے مقررہ فیس کی ادائیگی کے بعد سرکاری اجازت حاصل کرنی ہوتی تھی۔

## دنیاوی القاب کے بعد مذہبی القاب

اس کے بعد جب ترک قوم، خلافت عباسیہ کے تمام سیاہ و سفید کی مالک ہو گئی تو ان کے لئے شمس الدولہ یا ناصر الدولہ جیسے القاب میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ کیونکہ حکومت ان کے گھر کی لونڈی بن چکی تھی۔ اس لئے اب وہ بھی اسلام کے نام کی عظمت کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں شمس الدولہ کے مقابلے میں شمس الدین وغیرہ کے القاب زیادہ باعزت معلوم ہونے لگے۔ پھر ان القاب نے اس قدر رواج پایا کہ جہلاء تک اپنے بچوں کو انہی ناموں سے موسوم کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ علمائے دین بھی ان اسماء و القاب سے مانوس ہو گئے۔ اور انہیں اس بدعت پر عمل کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی۔

## عجمیوں کی اقتداء

اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے علامہ ابن حاج لکھتے ہیں۔

كان الناس يقتدون بالعالم ويهتدون بهديه۔ فصار الامر الى ان يحدث الاعاجم ومن لا علم عنده شيئا فتقتدى العلماء بهم۔ (المدخل - جلد اول - صفحہ ۱۲۱)

ایک وقت تھا جبکہ عامۃ الناس علماء کی اقتداء کرتے تھے اور ان کی ہدایت سے ہدایت پاتے تھے۔ لیکن اب معاملہ یہاں تک آن پہنچا ہے کہ عجمی اور جاہل جن بدعتوں کا اختراع کریں علمائے دین اس کی پیروی کریں۔

## علمائے حق کی مخالفت

جیسا کہ ہم شروع میں واضح کر چکے ہیں علمائے حق نے تقدس کا تاثر دینے والے ان اسماء والقاب کو اختیار کرنے کی سخت مخالفت کی تھی۔ امام النوویؒ کا ردِ عمل تو ہم شروع میں نقل کر چکے ہیں۔ اور یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ تمام اہل اخلاص علماء کا یہی مسلک رہا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

## متأخرین کے اضافے

لیکن بعد کے آنے والے حضرات اس صورتِ حالات پر قانع نہ رہے۔ اور انہوں نے اپنے بزرگانِ دین کو ایسے زائد اسماء اور القاب سے یاد کرنا شروع کر دیا جن کی انہوں نے اپنی زندگی میں مخالفت کی تھی۔ تاہم امام النوویؒ کے شاگردوں اور ان کے بعد آنے والے علمائے شافعیہ نے امام النووی کی خواہشات کا پورا پورا احترام کیا۔ وہ انہیں ان کے اصلی نام ہی سے یاد کرتے تھے۔ القاب کے نئے ماحول میں علمائے شافعیہ کا یہ طرزِ عمل دوسرے حضرات کو کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ جب ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے اس کی یوں وضاحت کی۔

انا نكره ان نسميه باسم كان يكرهه في حياته۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

ہم اس امر کو ناپسند کرتے ہیں کہ انہیں ان القاب سے یاد کریں جنہیں وہ اپنی زندگی میں ناپسند کرتے تھے۔

## ہمارے دور کی حالت

لیکن اس کے بعد جو نیا دور آیا (القريبة العهد بالحدوث) تو اس میں علماء کو محی الدین وغیرہ کے طرز کے اسماء والقاب سے پکارے جانے کی بدعت نے اتنا فروغ حاصل کیا کہ شاید ہی کوئی چھوٹا بڑا اہلِ علم اس کی زد سے محفوظ رہا ہو۔ بلکہ اب تو معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ

اذا خوطبوا بغير هذه الاسماء تشوشوا من اجل ذلك وتولدت الشحناء والبغضاء۔ فوضعنا لهم التزكية الخالصة حتى لا

يتشوشوا ولا تولى البغضاء ولا العداوة - (ایضاً صـ۱۲۰)

اگران علماء کوان اسماء والقاب کے بغیر پکارا جائے تو اس کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہوجاتے ہیں اور ان کے دل میں ایسا کرنے والے کے خلاف سخت نفرت اور غصہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اسلئے ہم نے ان کے اصلی ناموں کے ساتھ پاکیزگی اور تقدس کا اضافہ کردیا تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور نہ ہی ان میں غصہ اور دشمنی پیدا ہو۔

## مسئلہ کی شرعی حیثیت

جیساکہ واضح کیا جاچکا ہے ان القاب یعنی محی الدین وغیرہ سے ایک قسم کے تقدس کے مفہوم کا اظہار ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے ایسے تقدس کے اظہار سے منع فرمایا ہے۔ فرمانِ باری تعالےٰ ہے۔ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ۔ (تم خود اپنی پاکیزگی کا اظہار نہ کرو)۔ ایک دوسرے مقام پر ہے۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ۔ (کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف دیکھا ہے جو اپنے نفس کی پاکیزگی کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ پاکیزہ تو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہی بنا جا سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۱۸)

قرآنی تعلیمات کے بعد ہمارے سامنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان آتا ہے۔

لا تزكوا على الله احدًا ولكن قولوا إخاله كذا واظنه كذا۔ (ایضاً)

کسی کو اس پاکیزگی کا مستحق قرار نہ دو جو اسے صرف اللہ تعالےٰ کی طرف سے عطا ہو سکتی ہے بلکہ ایسے شخص کے بارے میں صرف یہ کہو کہ میرا خیال ہے کہ وہ ایسا ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ ایسا ہے۔

## فقہاء کے فیصلے

قرآن وسنت کی ان تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے جو فیصلے دیئے ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ امام ابوعبداللہ القرطبیؒ اپنی کتاب شرح اسماء الحسنیٰ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فقد دل الكتاب والسنة على المنع من تزكية الانسان نفسه

پس قرآن وسنت اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ کسی انسان کے لئے خود اپنی پاکیزگی کا اعلان کرنا یا تصور تک دینا جائز نہیں ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان واضح احکامات کے باوجود ہمارے ہاں اس بدعت کا ارتکاب بڑھتا جاتا ہے۔

قال علماؤنا ويجرى هذا المجرى ما قد كثر في الديار المصرية

وغيرها من بلاد العراق والعجم من تعتهم انفسهم بالنعوت التى تقتضى التزكية والثناء كزكى الدين، محى الدين، وعلم الدين و شبه ذالك ۔ (ایضاً)

ہمارے علماء کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے جو دیار مصریہ، بلاد عراق اور دوسرے عجمی ممالک میں رواج پا چکا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو ذکی الدین، محی الدین اور علم الدین جیسے القاب (کہ جن سے پاکیزگی اور تقدس کا اظہار ہوتا ہے) سے موسوم کرتے ہیں۔

## صحابہ کرامؓ کی مثال

اسی ضمن میں علامہ موصوف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثال پیش کرتے ہیں کہ اگر یہ القاب جائز ہوتے تو امتِ مسلمہ میں اس کے سب سے بڑے حقدار صحابہ کرامؓ ہوتے۔ کیونکہ ان کے شمس الہدایہ، انصار الدین اور ظلمت میں روشنی ہونے کی خود قرآن حکیم نے شہادت دی ہے۔ (صفحہ ۱۲۰)

## ناپسندیدہ امر کا ارتکاب

کتنے افسوس کی بات ہے کہ شریعت اسلامیہ جس معاملہ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے وہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہمیں اس کے غیر شرعی ہونے کا احساس تک نہیں رہا۔ اگر کوئی پکارنے والا آپ کو ان القاب سے پکارتا ہے تو وہ ایک ایسی بدعت کا ارتکاب کرتا ہے جس کی شریعت اسلامیہ کسی صورت اجازت نہیں دیتی۔ اور اگر آپ بھی اس پکار پر متوجہ ہوتے ہیں تو آپ بھی پکارنے والے کی طرح ایک ناپسندیدہ امر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۱۱۸)

## غیر حقیقی القاب

بحث کا یہ حصہ زیادہ تر حقیقی القاب سے متعلق ہے۔ یعنی ان اسماء و القاب سے وابستہ صفات کسی حد تک ملقب شخصیت میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود شریعت اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ لیکن ہمارے ہاں تو معاملہ اس حد سے گزر کر غیر حقیقی القاب تک جا پہنچا ہے۔ یعنی جس شخص کے ساتھ ایسے القاب کا اضافہ کیا جاتا ہے اس میں ان صفات کا پایا جانا تو کجا ان کی جھلک تک بھی موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ مصنف علیہ الرحمۃ ایسے طرزِ عمل کو دوہری برائی شمار کرتے ہیں۔ ایک القاب کی بدعت کی برائی اور دوسرے جھوٹ کا ارتکاب۔ کیونکہ جھوٹ کے بارے میں شریعت میں اور زیادہ سخت احکام ہیں۔

چنانچہ اس کے بعد جھوٹ کے شرعی احکام بڑی تفصیل سے نقل کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوئی جھوٹ تو اپنی جگہ پر رہا، اسلام جھوٹ کا شائبہ تک برداشت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ بے زبان

جانوروں کے ساتھ جھوٹا اشارہ تک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ علامہ صاحب اس کی وضاحت اسلامی لٹریچر کے ایک واقعہ کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی سواری کا جانور کسی طرح بھاگ نکلے جسے وہ کسی طرح پکڑ نہ سکتا ہو اور وہ اس کے پکڑنے کے لئے اس جانور کو خالی توبرہ اس طرح دکھائے گویا اس میں گھاس وغیرہ ہے حالانکہ اس میں گھاس وغیرہ کچھ نہیں اور جب جانور اس کو گھاس سمجھ کر آگے بڑھے اور اس کا مالک اُسے پکڑ لے تو یہ کارروائی بھی اس شخص کے ذمے ایک جھوٹ لکھی جائے گی اور قیامت کے دن اس سے اس جھوٹ کا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ (ص ۱۱۹)

## اس بدعت کے خاتمے کی تجاویز

آخر میں علامہ صاحب اس بدعت کے خاتمے کے لئے علمائے دین کے سامنے کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص ایسے اسماء والقاب سے پکارے تو اسے نرمی سے سمجھایا جائے کہ شریعت اس امر کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عالمِ دین کو ایسے القاب سے پکارے تو اس عالمِ دین کو خاموش نہیں رہنا چاہیئے بلکہ پکارنے والے کو مسئلہ کی صحیح شرعی حیثیت سمجھانی چاہیئے۔ آخر میں علامہ موصوف ہر عالمِ دین سے کم از کم یہ مطالبہ کرتے ہیں:-

> ”اقل ما یمکن فی حقہ فی غیر ھذا المجلس ان لا یستجیب لمن ناداہ بھذا الاسم حتی ینادیہ بالاسم المشروع“ (ص ۱۲۲)
>
> ہر عالمِ دین سے کم از کم یہ مطالبہ ہے کہ درس کی مجلس کے علاوہ اگر کوئی صاحب ان کو اصلی نام کی بجائے ایسے القاب سے پکارے تو وہ اس کا بالکل جواب نہ دیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کے معروف نام پکارنے پر مجبور ہو جائے۔

اور درس کی مجلس میں اس کے لئے یہی کافی ہوگا کہ وہ ایسا کرنے والوں کو تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرے۔ اگر ہمارے علماء نے صدقِ دل سے اس پر عمل کیا تو یہ بدعت اپنی موت آپ مر جائے گی۔

علامہ صاحب کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے اور معلوم نہیں کہ ان کی ان تجاویز پر کہاں تک عمل ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ القاب کی اس بدعت کا خاتمہ تو کجا یہ اب اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ عامۃ الناس یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ شریعت کا ایک حصہ ہیں اور یہ کہ اگر ان مذہبی بزرگوں کا نام ان القاب کے بغیر لیا جائے تو یہ گناہ کبیرہ کے مرادف ہوگا۔

(باقی)

# نقد و نظر

## برصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظامِ عدل گستری

مصنفہ: پروفیسر عبدالحفیظ صدیقی۔ شائع کردہ: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد)

ضخامت: ۲۲۲ صفحات۔ قیمت مجلد: پانچ روپے پچاس پیسے۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اول حصہ عہدِ رسالت مآبؐ۔ خلفائے راشدینؓ، اور بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں نظامِ عدل پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم میں سلطنتِ دہلی اور دکن کی بادشاہتوں میں نظامِ عدل سے بحث کی گئی ہے۔ اور حصہ سوم تبصرہ پر مشتمل ہے جو دراصل ماسبق کی صدائے بازگشت ہے۔ تاریخی اعتبار سے کتاب اہم ہے اور محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک کتاب کا نام صحیح نہیں ——— اور حقیقت یہ ہے کہ یہ غلطی ہمارے ہاں عام ہے۔ "اسلامی" صرف اس نظام کو کہنا چاہیئے جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے مسلمانوں کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض چیزیں اسلام کے مطابق بھی نہ ہوں۔ لیکن اسلامِ خالص اس دور میں باقی نہیں رہا تھا۔ ہمیں "اسلامی" صرف اس چیز کو کہنا چاہیئے جو اسلامِ خالص کے مطابق ہوں۔ نہ کہ ہر اس بات کو جسے مسلمانوں نے کیا ہو۔ اسلامؔ اور (صدرِ اول کے بعد کے) مسلمانوں کے مسلک و کردار میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام کا کوئی صحیح مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکتا۔ صدرِ اول کے اسلامی نظامِ حیات کا مفہوم قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ اور وہیں سے اس کا صحیح تصور متعین ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور غلطی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں مروج اسلام کو "اسلام" کہہ کر پکارتے ہیں اور وہیں سے اپنے ..... مروجہ اسلام کی سندیں لاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی شدید ترین ضد خود ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ جس درخت کی جڑ اسلام کی نقیض ہو اس کے برگ و بار کس طرح اسلامی ہو سکتے ہیں؟

——— (پرویز) ———

# حقائق وعبر

## روایات پرکھنے کا معیار

جماعت اہل حدیث کے ترجمان 'الاعتصام' (لاہور) کی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"دسمبر ۱۹۶۹ء کے رسالہ "فکر ونظر" راولپنڈی میں لکھا گیا ہے۔ "حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا فردوہ (ص ۹) "۔ جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو، ورنہ اسے چھوڑ دو۔

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے جتنی بڑی شہرت پذیر ہے اسی قدر یہ بڑا جھوٹ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذمہ لگا یا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی اسی دور میں ماہرین فن حدیث ائمہ کرامؒ نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسولؐ نہیں بلکہ یہ عبارت زنادقہ (گمراہ لوگوں) کی وضع کردہ ہے۔ چنانچہ چوتھی صدی کے نامور فقیہہ و محدث امام خطابی نے صراحت فرمائی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للفتنی ص ۲۸ و مولانا محمد عبد الحیٰ لکھنوی حنفیؒ کی ظفر الامانی ص ۲۶۷) نیز دیکھئے جامع بیان العلم ابن عبد البرؒ ص ۱۹۱ ج ۲) امید ہے کہ محترم مقالہ نگار (ڈاکٹر معصومی صاحب) آئندہ احتیاط فرمائیں گے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ یعنی اگر کوئی حدیث قرآن کے مطابق ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ رسول اللہ کی نہیں۔ اور اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو اسے صحیح سمجھئے۔ اتنا ہی نہ

وانا الیہ راجعون !

اور یہ کچھ اس ذاتِ اقدس و اعظم ؐ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا یہ اعلان خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ ...اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ .... (۶:۵۰) میں تو اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

(٥)

## ایں ہمہ آوردۂ تست

جب سے لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ مودودی صاحب امریکہ کے ایجنٹ ہیں، انہوں نے امریکہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو !
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

چنانچہ فروری ۷۰ء کے ترجمان القرآن کے اشارات اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔ ان میں لکھا ہے کہ

امریکہ اور روس کے درمیان ممکن ہے سامراجی عزائم کی تکمیل کے معاملہ میں کچھ اختلافات ہوں اور مادی مفادات کی تقسیم کے سلسلے میں ان کے مابین کبھی کبھی تلخی اور رنجش پیدا بھی ہو جاتی ہو، مگر اسلام کو مٹا کر اور اس کے مقابلہ میں غیر اسلامی نظریات و اقدار کو قوت بہم پہنچانے اور اسلام کے علمبرداروں کی طاقت کو توڑنے کے معاملہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ مسلم ممالک میں احیائے اسلام کے لئے جو تحریکات کام کر رہی ہیں یہ دونوں ممالک انہیں برباد کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور جب بھی انہیں کسی طرف سے زک پہنچائی جاتی ہے۔ انہیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔

(روس کو سرِ دست الگ رکھیئے) سوال یہ ہے کہ امریکہ جیسے اسلام دشمن ملک کے، پاکستان میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سلسلہ میں ہم مودودی صاحب کی اس تقریر کا اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں جو انہوں نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں (جب پاکستان کا رجحان امریکہ کی طرف بڑھ رہا تھا) کراچی میں کی تھی اور جو جماعتِ اسلامی کے ترجمان تسنیم کی ۱۶ر دسمبر کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

اگر یہ بلاک (اینگلو امریکی بلاک) فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی پر بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے

عوام کا تعاون حاصل کرتا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے ان حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر تسلط اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو پوری طاقت نہیں لگا سکتی جب تک ملک کے باشندے اس جنگ کو اپنی جنگ نہ سمجھیں۔ بلکہ اگر معاملہ برعکس ہوتا ہے تو ملک کے باشندے جابر حکمرانوں کے چنگل سے نکلنے کے لئے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اسی بات کا اعادہ انہوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو لاہور میں کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ جانتے تھے کہ امریکہ اس قدر اسلام کا دشمن ہے اور جس ملک میں اس کا اثر و رسوخ بڑھ جاتا ہے وہاں اسلام کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، تو آپ نے اہل پاکستان کو اس سے متنبہ کیوں نہ کیا اور ان سے یہ کیوں نہ کہا کہ خبردار! اس اسلام دشمن ملک کا ایک قدم بھی اس ملک میں پڑنے نہ پائے۔ آپ بجائے اس کے کہ یہ کرتے، آپ نے الٹا امریکہ کو یہ مشورہ دیا کہ اس ملک میں پختہ قدم جمانے کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام سے رابطہ بڑھاؤ اور ان کا تعاون حاصل کرو۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب امریکہ نے یہاں اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے تو آپ نے اس کی روک تھام کے لئے کیا کیا؟ آپ آج سوشلزم کی مخالفت میں جلے پاؤں کی بلی بنے پھر رہے ہیں۔ جب آپ خود کہتے ہیں کہ روس اور امریکہ دونوں اسلام کے یکساں دشمن ہیں، تو آپ نے امریکی اثر و رسوخ کے خلاف وہ کچھ کیوں نہ کیا جو کچھ آج آپ سوشلزم کے خلاف کر رہے ہیں؟ اگر اسے باور بھی کر لیا جائے کہ آپ نے امریکی اثر و رسوخ کے عام کرنے میں امریکہ سے تعاون نہیں کیا تو کم از کم یہ تو حقیقت ہے کہ آپ نے اس کے خلاف لب کشائی تک بھی نہیں کی۔ پھر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ مسلم ممالک میں سے جن میں سوشلزم کا اثر بڑھ رہا ہے ان کی مخالفت میں تو آپ دن رات ایک کر رہے ہیں اور ان کے متعلق آپ یہاں تک بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ کفر کی آغوش میں چلے گئے لیکن جن ممالک میں امریکی اثر غالب ہے، نہ صرف یہ کہ ان کی مخالفت میں ایک لفظ تک آپ کی زبان پر نہیں بلکہ ان کی مدح و ستائش میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ اس وقت امریکہ کی خلاف جو کچھ آپ کر رہے ہیں اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ نے جب سوشلزم کے خلاف "علم جہاد" بلند کیا تو لوگوں کے اس طعن سے بچنے کے لئے کہ یہ سب کچھ امریکہ کے اشارہ پر کیا جا رہا ہے، چین اور روس کے ساتھ امریکہ کو بھی دو چار سنانی شروع کر دیں۔ ان دونوں مخالفتوں میں فرق کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے

لگ سکتا ہے کہ چین نے حکومتِ پاکستان سے احتجاج کیا ہے کہ پاکستان میں ان کے مسلک کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے' مملکتِ چین اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ لیکن امریکہ اپنے آپ کو' پہلے سے بھی زیادہ پاکستان کا دوست ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چین کے اس احتجاج کے اثرات بڑے دوررس اور عواقب بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اگر چین' اس طرح دل برداشتہ ہو کر' پاکستان سے اپنے تعلقات منقطع کر لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد پاکستان بالکلیہ امریکہ کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے ـــــ اور یہی' پاکستان میں چین کے خلاف پراپیگنڈہ کا امریکی مقصود ہے جو جماعتِ اسلامی کے ذریعے حاصل ہو رہا ہے۔ ہم ان حضرات پر اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ پاکستان میں سارے بدھو بستے ہیں جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہاں اسلام کی بہی خواہی کی آڑ میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور ملک میں امریکی اثر و رسوخ کے عام اور پختہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔ روپے کے زور پر پراپیگنڈہ کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت بین نگاہوں سے فریب کو چھپایا نہیں جا سکتا۔

---

# طلوعِ اسلام کالج

(بسلسلہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۰ء)

**(فہرست الف)**

محترم ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب ۔ لاہور چھاؤنی ۲۵۰۰/- روپے

**(فہرست ۔ ب)**

عزیزہ مسرت چغتائی بنت محترم عبدالرحمٰن چغتائی صاحب (بتقریب ختم قرآن کریم) ۔ ۵۰۰/- روپے

## تصحیح :-

(۱) نمبر شمار ۲۰ (صفحہ ۷۲۔ شمارہ دسمبر ۱۹۶۹ء) کے سامنے "محترم مختار احمد صدیقی صاحب لاہور" کی بجائے "محترم مشتاق احمد صدیقی صاحب لاہور" ہونا چاہیے۔

(۲) فہرست (ب) نمبر شمار ۹ (صفحہ ۷۴، شمارہ فروری ۱۹۷۰ء) کے سامنے "محترم این ۔ اے ۔ خانصاحب" کی بجائے "محترم این ۔ اے چوہدری صاحب" ہونا چاہیے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔

**(نوٹ)** کچھ متفرق رقوم بطور عطیہ اس ماہ میں وصول ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل اگلے پرچہ میں شائع کر دی جائے گی۔

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

# بابُ المراسلات

## صغر سنی کی شادی

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"ترجمان القرآن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے صفحہ ۸۹ پر مودودی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

'اس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اُس عورت کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو۔ کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب ۔ ۴۹) اِس لئے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، صریحاً اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اِس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اُسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا۔"

خط کا شیدہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی صاحب صغر سنی کے نکاح کا جواز پیش کرتے ہوئے نابالغ لڑکی سے خلوتِ صحیحہ کرنے کو بھی جائز اور درست قرار دے رہے ہیں اور اس بہیمانہ فعل کو قرآنی سند کا سہارا دینے کی کتنی ناپاک جسارت کی گئی ہے۔ مفکرِ اسلام کی اِس تفہیم قرآنی کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں حقائق و عبر کے عنوان کے تحت تبصرہ فرمایا جائے تاکہ جمہور مسلمان اُن کی قرآن فہمی۔ تدبر فی الدین اور اجتہادی بصیرت کو ملاحظہ فرما کر اپنی عاقبت کو سنوارنے کا بروقت انتظام کر سکیں اور سید صاحب کے تفقہ فی الدین کا طنطنہ اور غلغلہ سب پر آشکارا ہو جائے۔"

**طلوعِ اسلام** ——— سوال مودودی صاحب کی قرآن فہمی، تدبر فی الدین، اجتہادی بصیرت،

اور ان کے طنطنہ اور فلفلہ کا نہیں۔ اصل سوال اس نفسیاتی مرض کا ہے جس میں اس قسم کے حضرات بدقسمتی سے مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے ان کی ذہنیت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ اس قسم کے فتوے دیتے رہتے ہیں کہ

(۱) جنگ میں دشمن کی جو عورتیں قید ہو کر آئیں انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ وہ ان سے بلا نکاح اور بلا قیدِ تعداد، جنسی تعلقات قائم کریں۔ اور جب جی بھر جائے تو انہیں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ یا

(۲) اگر کبھی ایسا ہو کہ سمندر میں جہاز غرق ہو جائے اور اس کی سواریوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت بچ کر کسی جزیرے میں جا اتریں۔ تو وہ وہاں عارضی "نکاح" کر کے جنسی اختلاط کر سکتے ہیں۔ یا

(۳) جو شخص اپنے جنسی جوش سے مغلوب ہو کر استمنا بالید (MASTURBATION) کر لے تو خدا اُسے سزا نہیں دیگا۔ یا

(۴) کفار کی جو لڑکیاں کم سنی میں وفات پا جائینگی وہ جنت میں حوریں بن کر مومنین کے تصرف میں آجائینگی۔

(ان ارشاداتِ عالیہ کے حوالے ہمارے پاس موجود ہیں)

اسی قبیل سے صغرِ سنی کے نکاح کے جواز کا فتوےٰ ہے۔ لیکن مقامِ تأسف ہی نہیں بلکہ مقامِ مرگ ہے کہ اس کے لئے یہ حضرات کبھی حضرت عائشہؓ کی عروسی کے وقت کی عمر نو سال قرار دیتے ہیں اور کبھی قرآن کی آیات سے کھیل کھیل کر اس کے جواز کی سندیں لاتے ہیں۔ اور ایسا کرتے وقت نہ حضورؐ کی عظمتِ شان کا احساس ان کے دامنگیر ہوتا ہے نہ خدا کا خوف!

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ مطلقہ کی عدت تین حیض کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جن عورتوں کو حیض نہ آرہا ہو، ان کی عدت کس طرح شمار کی جائے۔ اس کے لئے سورۃ الطلاق میں فرمایا کہ:

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ (۶۵/۴)

تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر ان کی عدت کے شمار کرنے میں تمہیں شبہ لاحق ہو تو ان کی عدت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے شمار کر لو۔

یہی صورت ان عورتوں کے سلسلہ میں بھی ہو گی جنہیں حیض نہ آرہا ہو۔

جن عورتوں کو حیض نہیں آرہا، ان کی دو شکلیں ہوں گی۔

(۱) وہ عورتیں جو اس قدر عمر رسیدہ ہو چکی ہوں کہ انہیں حیض آنا بند ہو گیا ہو۔ یا

(۲) وہ عورتیں جن کی عمر تو ایسی ہو جس میں بالعموم حیض آیا کرتا ہے لیکن کسی عارضہ کی وجہ سے انہیں

حیض نہ آرہا ہو۔

ان دونوں شکلوں میں عدت کا شمار حیض کے بجائے مہینوں سے ہوگا۔

مودودی صاحب لَمْ يَحِضْنَ کا ترجمہ کرتے ہیں — " ایسی لڑکیاں جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو" ہم پوچھتے یہ ہیں کہ لَمْ يَحِضْنَ کا یہ ترجمہ کس قاعدے کی رو سے کیا گیا ہے ؟ اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ جنہیں حیض نہ آسکا ہو۔ یا حیض نہ آرہا ہو۔ اس آیت سے صغر سنی کے نکاح اور نابالغ لڑکی کے ساتھ خلوت' کا جواز ثابت کرنا' قرآن سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کے لئے "جوانی کی عمر" خود بتادی ہے۔ (دیکھئے ۴/۶ ; ۶/۱۵۳ ; ۱۷/۳۴ )۔ واضح رہے کہ مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ ایسی صورتیں ہوتی ہیں جن میں عورتوں کو (سنّ ایاس سے پہلے ہی) حیض بند ہوجاتا ہے۔ یا بے قاعدگی سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ "ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر حیض نہیں آتا" (ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء ، صفحہ ۸۹ )۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ یہ کہ ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ ایک نوجوان لڑکے کی منگنی ایک کمسن لڑکی سے کردی گئی ہے۔ وہ اپنی جنسی خواہش پر ضبط نہیں کرسکتا۔ تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

> اس لڑکے کے خاندان نے ایک جوان آدمی کو ایک کمسن لڑکی کے ساتھ منسوب کرکے اپنی نادانی کا پورا پورا ثبوت دے دیا ہے۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم صفحہ ۲۲۲)

کوئی ان سے پوچھے کہ جب کمسن لڑکی کے ساتھ نکاح اور خلوت کی اجازت (بقول ان کے) خود خدا نے دیدی ہے تو کمسن لڑکی کے ساتھ منگنی کر دینے کو نادانی قرار دے کر آپ خدا پر معترض نہیں ہو رہے ؟ دیکھا آپ نے جادو کس طرح سر پر چڑھ کر بولتا ہے ؟

آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ یہ حضرات عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کے درپے کیوں ہیں ؟ اسلئے کہ ان قوانین کی رو سے 'نابالغ لڑکی (یا لڑکے) کی شادی کی اجازت نہیں۔ اور یہی پابندی ان حضرات پر شاق گزرتی ہے۔ یہاں (خدا نکردہ) ان حضرات کی خود ساختہ شریعت کے قوانین نافذ ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ کیا کیا چیزیں آپ کے سامنے آتیں اور " خدا اور رسولؐ کے نام پر " آپ سے منوائی جاتی ہیں ! ———

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے !

# بصیرت افروز - انقلاب آفریں لٹریچر

## (۱) لغات القرآن - (پرویز)

یہ محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں۔ اس میں

(۱) تمام قرآنی الفاظ کے معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت اور قرآن کریم کی روشنی میں متعین کئے گئے ہیں۔ اتنے حصے کو آپ لغات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصہ تفسیر القرآن کا ہے۔

(۳) دین کے تمام بنیادی تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ سے یہ حصہ دین کی بنیادی تعلیم کا نصاب ہے۔

(۴) شروع میں عربی زبان کے بنیادی قواعد و اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصہ عربی زبان کا معلم ہے۔ اور

(۵) تمام قرآنی الفاظ کی ایک جامع فہرست میں ہر لفظ کے سامنے اسکا مادہ دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا انڈکس ہے۔

آپ ایک مرتبہ اس لغات کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں تو قرآن کریم کے سمجھنے اور دین کے بنیادی اصولوں کو جاننے کے لئے آپ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کتاب چار جلدوں میں بڑے پاکیزہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ پہلی تین جلدیں۔ پندرہ روپے فی جلد، چوتھی جلد۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی قیمت۔ پچاس روپے۔

## (۲) معراج انسانیت - (پرویز)

سیرتِ صاحبِ قرآن خود قرآن کے آئینے میں۔ حضور خاتم الانبیاءؐ کی سیرتِ طیبہ تمام نوعِ انسانی کے لئے جگمگاتا مینارہ ہے جس سے ہر رہ گم کردہ زندگی کے ساحلِ مقصود کا صحیح صحیح پتہ پا سکتا ہے۔ حضورؐ کی سچی اور قابلِ اعتماد سیرت (جسے نوعِ انسانی کیلئے بہترین نمونہ بننا ہے) قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حیاتِ مقدسہ کا وہی نقشہ قابلِ اعتماد ہوگا جسے قرآن کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہو۔ یہ کتاب اسی انداز ترتیب کی کامیاب پیشکش ہے جسمیں کسی مقام پر بھی تاریخی روایات کے دھندلکوں کو قرآنی حقائق پر اثر انداز نہیں ہونے دیا گیا۔ سیرت مقدسہ پر حسین ترین تصنیف۔ ختم نبوت کا عظیم فلسفہ۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب مصنف کی نظر ثانی نے اسے جدید پیکر عطا کیا ہے۔ ضخامت قریب پانچسو صفحات قیمت۔ بیس روپے۔

**(۳) انسان نے کیا سوچا؟ - (پرویز)**

سقراط اور افلاطون سے لے کر برٹرنڈرسل اور ٹوئن بی تک مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے کائنات اور انسانی دنیا کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں انہیں اس انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ انسان وحی کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکیگی۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت بارہ روپیے۔

**(۴) اسلام کیا ہے؟ - (پرویز)**

یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟۔ قیمت:۔ قسم اعلیٰ - آٹھ روپے، سستا ایڈیشن۔ چار روپے۔

**(۵) جہانِ فردا - (پرویز)**

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ اس کا جواب ملے گا اس کتاب سے جس میں قرآن کریم کی رو سے موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ قیامت۔ اعمال نامہ۔ جہنم۔ جنت وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ قیمت:۔ اعلیٰ ایڈیشن۔ دس روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چھ روپے۔

**(۶) شعلۂ مستور - (پرویز)**

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کوائفِ حیات۔ کیا آپ بن باپ پیدا ہوئے؟ کیا یہود نے واقعی آپ کو فروخت کر دیا تھا؟ کیا آپ آسمانوں پر زندہ ہیں؟ کیا آپ پھر نازل ہوں گے؟ آپ کی صحیح تعلیم کیا تھی؟ ایک نئے انداز سے عجیب و غریب حقائق کی نقاب کشائی اور رسم خانقاہیت کی عبرت آموز داستان۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت: مجلد۔ چھ روپے۔

**(۷) خدا اور سرمایہ دار**

موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کریم کے معاشی نظام سے کیا جاتا۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت - مجلد نو روپے۔

**(۸) نظامِ ربوبیت - (پرویز)**

نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے! اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی

تفصیل اس کتاب میں ملے گی اور جس کی رُو سے دنیا میں کوئی شخص نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ کوئی امیر رہیگا نہ غریب۔ نہ کوئی قارون ہوگا نہ بھکاری۔ یہ ہمارے دور کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

**(۹) فردوسِ گم گشتہ۔ (پرویز)** محترم پرویز صاحب کے ان مضامین اور تقاریر کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دیں گی۔ قیمت: آٹھ روپے۔

**(۱۰) سلسبیل۔ (پرویز)** قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا دوسرا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت: آٹھ روپے

**(۱۱) بہارِ نَو۔ (پرویز)** یہ جناب پرویز کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جس سے ذہنوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت پانچ روپے

**(۱۲) سلیم کے نام خطوط۔ (پرویز)** سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے بیزار کر دیا ہے۔ اس کے دل میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک مشفق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوط کی شکل میں دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی رُو سے خالص قرآنی فکر کی روشنی میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت: حصہ اول۔ آٹھ روپے۔ قیمت حصہ دوم و سوم۔ چھ چھ روپے۔

**(۱۳) طاہرہ کے نام خطوط۔ (پرویز)** عائلی زندگی کے بنیادی اور اُلجھے ہوئے مسائل۔ ان مسائل کے بارے میں جناب پرویز نے اپنی ملّت کی طاہرہ بیٹیوں کو مخصوص مشفقانہ انداز سے مخاطب کیا ہے۔ اور انہیں بتایا ہے کہ خدا کا دین انہیں کس قدر بلند مقام عطا کرتا ہے اور ان سے کن ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ آنسوؤں اور آہوں کے جہنم میں کیونکر جنتی معاشرے کی صبحِ بہار نمودار ہو سکے گی۔ یہ کتاب خواتینِ ملّت کے قلب و نگاہ میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کرتی ہے۔ اس کتاب کے آخری باب میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی۔ قیمت: چھ روپے۔

**(۱۴) قرآنی قوانین۔ (پرویز)** ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل اقدار

کو بھی مدوّن کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔ قیمت: تین روپے۔

**(۱۵) جہاد۔ (پرویز)** جہاد کیا ہے؟ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہے؟ مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ بصیرت افروز۔ حیات آموز۔ قیمت: دو روپے۔

**(۱۶) مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں۔ (پرویز)** مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی کیا حالت ہے۔ اس کتاب میں اس سوال کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ نیز اس میں یہودیت، عیسائیت، زرتشتی مذہب، ہندومت، بدھ مت، جین مت، چین اور جاپان کے مذاہب کی مبنیہ آسمانی کتابوں کی کہانی دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ محفوظ چلا آ رہا ہے۔ قیمت: تین روپے۔

**(۱۷) اسبابِ زوالِ امّت۔ (پرویز)** ملّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

**(۱۸) اسلامی معاشرت۔ (پرویز)** اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآنِ کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کے دلوں میں صحیح اسلام کی تعلیم نقش کرنے کے لئے، نیز کم تعلیم یافتہ حضرات اور عورتوں کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت: دو روپے

**(۱۹) اقبالؒ اور قرآن۔ (پرویز)** جس جہانِ نو کا تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اس کے خدوخال سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جس میں اقبالؒ اور قرآن بیک وقت آپ کے سامنے آ جائیں۔ قرآن کے حقائق اور اقبالؒ کا بیان جس دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ قیمت: دو روپے۔

**(۲۰) قرآنی فیصلے** زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے اور ہم کیا کرتے ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ صدقات

قربانی ۔ ترکہ ۔ وصیت ۔ نکاح ۔ طلاق ۔ اوقاف ۔ شراب ۔ جوا ۔ حرام وحلال یا مثلاً شب برات ۔ عید میلاد ۔ قرآن کی حفاظت ۔ ناسخ ومنسوخ ۔ تصویر کشی ۔ موسیقی ۔ سینما ۔ مشاعرے ۔ عذابِ قبر ۔ حیات بعد الممات ۔ قومی ملکیت ۔ نبی اکرمؐ وعلم غیب ۔ حضورؐ کا معراج ۔ ولی اور الہام ۔ تاریخ اور قرآن ۔ مرکزِ ملت ۔ غلام اور لونڈیاں وغیرہ بیسیوں باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کو علم نہیں کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے ۔ یہ سب کچھ ایک جگہ اس کتاب میں مل جائے گا ۔ قیمت جلد اول ' دوم ۳/۲۵ روپے فی جلد ۔ جلد سوم ۔ تین روپے فی جلد ۔

## (۲۱) مقامِ حدیث

یہ وہ کتاب ہے جس نے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے ۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے ؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا ؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں ؟ حدیثوں کے جو مجموعے جائے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے ؟ رسول اللہؐ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے ؟ اقرار وانکارِ حدیث سے کیا مراد ہے ؟ علمِ حدیث کے متعلق یہ جامع کتاب اس قدر پُر از معلومات ہے کہ آپ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے ۔ قیمت :۔ چار روپے ۔

## (۲۲) منزل بہ منزل

تحریک طلوعِ اسلام دراصل قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک تنظیمی کوشش ہے ۔ یہ تحریک کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچی ہے ۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے اور کھڑے ہیں ۔ قرآنی فکر کی یہ تحریک ان موانعات کو کس طرح دور کرتی اور امت کو کیسے قرآن مجید کے قریب لاتی ہے ۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کے سالانہ اجتماعات نے کیا نمایاں خدمات سرانجام دیں ' ان اجتماعات میں اس تحریک کے بانی جناب پرویز نے قوم کو کیا پیغام دیا ۔ یہ اس قافلہ قرآنی کی جادہ پیمائی کی نہایت حسین وسادہ اور بے حد جاذب ودلکش داستان ہے جسے نہایت حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ قیمت :۔ چھ روپے ۔

## (۲۳) قرآنی دستورِ پاکستان

قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کردہ قرارداد مقاصد وبنیادی اصول وحقوق اور دستور کے مسودات ۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ ۔ جماعتِ اسلامی کی دستوری سفارشات اور ان کی فکر ونظر کے تضادات پر تبصرہ ۔ غرضیکہ اس مجموعہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے تدوینِ دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں آپ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی ۔ لیکن اصولی طور پر اس کی افادیت اب تک باقی ہے ۔ قیمت ۲/۵۰ روپے

## (۲۴) مزاج شناسِ رسولؐ

سب سے خطرناک رہزنی وہ ہے جو خدا اور رسولؐ کے نام پر مذہب کے نقاب میں کی جائے ۔ اس میں انسانیت لٹتی اور عاقبت تباہ

ہوتی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ لوگ کس طرح مذہب کے نام پر اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جماعتِ اسلامی کے عزائم کیا ہیں اور وہ کس طرح قوت حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کی ڈکٹیٹرشپ پر اتنا مواد اور اس انداز سے مربوط شکل میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

قیمت چار/۴ روپے۔

## (۲۵) قتلِ مرتد۔ غلام اور لونڈیاں

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟ کیا اسلام جنگ کے قیدیوں کو غلام اور قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے، بلا تعداد گھروں میں ڈال لینے اور بازاروں میں فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ قرآن کی رو سے ان اہم سوالات کا جواب کیا ہے؟ مدلل اور مسکت بحث۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ مصر ہے کہ جب پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا تو اس میں یہی قوانین رائج ہوں گے۔ قیمت:- ۱/۵۰ روپے۔

## (۲۶) عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا۔ (دوسرا ایڈیشن)

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کئی ایک ایسی باتیں رائج ہیں جنہیں وہ حقیقت سمجھتے ہیں لیکن در اصل وہ افسانے ہیں۔ جناب پرویز نے ان افسانوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بڑی دلچسپ اور بصیرت افروز کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

## (۲۷) انسانیت کا آخری سہارا۔ (دوسرا ایڈیشن)

یہ وہ بصیرت افروز خطاب ہے جس سے جناب پرویز نے دسویں طلوعِ اسلام کی کنونشن کے الوداعی اجلاس کو نوازا جس کے جذب و انہماک اور اثر و کیف کا یہ عالم تھا کہ کوئی قلب نہ تھا جو درد آگیں اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ قیمت:- ایک روپیہ۔

## (۲۸) عربی خود سیکھئے۔ (زیر طبع اول)

قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جاتے جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجاتے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ دوسرا ایڈیشن —

قیمت:- ۴/۵۰ روپے

**(۲۹) وحشتناک ہوئے انسان** - (عنایت اللہ)

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کی دنیا کے ہراسرار حالات۔ قاتلوں۔ ڈاکوؤں۔ گرہ کٹوں اور سنگین مجرموں کے جرائم کا پس منظر۔ جیل میں بسنے والی دنیا کے عجیب، وحشتناک، حیرت انگیز لیکن عبرت آموز حالات جو طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ اور گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہیں۔

قیمت :- ۵/- روپے۔

**(۳۰) الفتنۃ الکبریٰ** - (طٰہٰ حسین مصری)

حضور رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پچیس سال بعد ہی امیرالمومنین حضرت عثمان رضؓ کس طرح دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے۔ اور امتِ مسلمہ کو کن مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ ان حوادث کے محرکات کیا تھے اور ان کا پس منظر کیا۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔

قیمت :- ۶/- روپے

**(۳۱) فجر الاسلام** - (احمد امین مصری)

مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین کی معرکہ آرا تصنیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام کے پراز معلومات حالات۔ اسلام کے قرنِ اول کی روشن داستان۔ ہر بات مستند۔ ہر دعویٰ مدلل۔ تاریخ اسلام پر ایسی کتاب اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔

قیمت :- جلد اول۔ دوم۔ چار چار روپے۔

**(۳۲) اسلام پر کیا گزری؟** - (احمد امین مصری)

علامہ احمد امین مصری کے سلسلہ تاریخ اسلام کی دوسری کڑی۔ بنی امیہ و عباسیہ کے زمانے میں اسلام کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہوا۔ اس میں کون کون سی باتیں باہر سے آکر مل گئیں۔ یہ ساری کہانی بڑی بصیرت افروز اور عبرت آموز ہے۔ قیمت :- پانچ روپے۔

**(۳۳) پاکستان کا معمارِ اوّل** - (صفدر سلیمی)

سرسید کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا مقامِ بلند ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ سرسید کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں اس مختصر لیکن جامع تصنیف میں دیکھئے۔ قیمت :- صرف -/۳ روپے۔

**(۳۴) تاریخ الامّت** - (اسلم جیراجپوری)

امت کی تمام سرگذشت۔ مختصر، سلیس

اور سادہ انداز میں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| جلد اول | سیرت رسولؐ | قیمت | ۲/۵۰ روپے |
| " دوم | خلافتِ راشدہ | " | ۲/۵۰ " |
| " سوم | خلافتِ بنی امیہ | " | ۲/- " |
| " چہارم | خلافتِ عباسیہ | " | ۲/۵۰ " |
| " پنجم | خلافتِ عباسیہ | " | ۳/- " |
| " ششم | تاریخ مصر | " | ۲/۵۰ " |
| " ہفتم | آلِ عثمان | " | ۲/- " |
| " ہشتم | قرآن و تاریخ اسلام | " | ۲/۵۰ " |

## THE PRINCIPLES OF LAW MAKING IN ISLAM. (۳۵)

اس وقت ملک کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی قوانین کس طرح مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا نہایت واضح جواب مختلف اسلامی ممالک کے بلند ترین مفکرین کے قلم سے ۔

(قیمت صرف -/۲ روپے)

## ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION. (۳۶)

اسلام نظامِ حیات (دین) تھا۔ جسے مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہی ہماری تمام دشواریوں کی علت ہے اور اسی بنا پر اسلام پر مخالفین کی طرف سے اعتراضات ہوتے ہیں جناب پرویز نے اپنی اس قابلِ فخر تصنیف میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ اسلامی لٹریچر میں اس نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس نے پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقہ اور اہلِ مغرب کے مفکرین کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کی صوری حیثیت بھی نہایت شاندار ہے۔ قیمت: قسم اعلیٰ -/۲۵ روپے۔ سستا ایڈیشن -/۱۶ روپے۔

**مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار بیرون موری دروازہ لاہور**